مجلس ادارت

۱. مولانا سید ابوالحسن علی ندوی　　۲. ڈاکٹر نذیر احمد

۳. ضیاء الدین اصلاحی

معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپیے

پاکستان میں سالانہ دوسو روپیے　فی شمارہ سات روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس. ایم. کالج. اسٹریچن روڈ کراچی

* سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

* رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے. اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیئے. اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا.

* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں.

* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائیگی.
کمیشن ۲۵٪ ہوگا. رقم پیشگی آنی چاہیے.

فہرست

مضمون نگاران معارف

جلد ۱۶۵

ماہ جنوری ۲۰۰۰ء تا ماہ جون ۲۰۰۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات	نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۱	ڈاکٹر اعجاز فاروق اکرم صاحب	۳۵۱	۱۲	ضیاء الدین اصلاحی	۲-۷۳، ۷۴-۷۶-۷۷
۲	پروفیسر اکبر رحمانی صاحب	۵۶			۸۲-۱۴۲، ۲۴۱-۲۴۳
۳	جناب انیس احمد چشتی صاحب	۳۶			۲۲۲-۳۰۰، ۳۰۲
۴	جناب جمشید احمد ندوی صاحب	۱۸-۳۸۴	۱۳	جناب عبدالقدوس رومی صاحب	۲۱۸-۲۲۹
۵	ڈاکٹر حافظ عبدالرحیم صاحب	۵	۱۴	ڈاکٹر عمر کمال الدین صاحب	۱۳۴
۶	جناب خورشید نعمانی صاحب	۲۱۸	۱۵	حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی	۴۸-۴۵۶، ۳۳۰-۳۳۷
۷	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی صاحب	۲۳۶			۳۱۵-۳۹۵، ۴۷۸
۸	جناب سرور عالم صاحب ندوی	۳۶۶	۱۶	جناب قمر سنبھلی صاحب	۲۲۸
۹	مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندویؒ	۲۱۷	۱۷	کلیم صفات اصلاحی	۴۳-۳۱۹، ۳۷۲
۱۰	جناب سید سلمان صاحب ندوی	۳۹۲	۱۸	جناب محبوب الرحمن فاروقی صاحب	۳۱۳
۱۱	ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب صاحب	۴۳۸	۱۹	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی صاحب	۴۵۰
			۲۰	جناب محمد امین صاحب	۲۰۸

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۶۵

ماہ جنوری ۲۰۰۰ء تا ماہ جون ۲۰۰۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۶۵ ماہ شوال المکرم ۱۴۲۰ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۰۰ء عدد ۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پھر شورش و ہیجان برپا ہے اور پہلے ہی کی طرح اس دفعہ بھی اس کا ذمہ دار وائس چانسلر اور یونیورسٹی انتظامیہ کو بتایا جاتا ہے، چنانچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی نے اپنے ایک ہنگامی اجلاس کی متفقہ قرارداد میں یونیورسٹی کی خراب صورتِ حال کے لئے وائس چانسلر کو موردِ الزام قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ یونیورسٹی برادری کا مکمل اعتماد کھو چکے ہیں اس لئے خود مستعفی ہو جائیں یا حکومت ان کو واپس بلالے، طلبہ، اساتذہ، یونیورسٹی کے عملے کی بڑی تعداد کو بھی وائس چانسلر کے آمرانہ اور غیر جمہوری رویے کی شکایت ہے، ان کے نزدیک بھی حالات کو خراب کرنے میں وہ ایک اہم عامل ہیں، ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی بڑے سرکاری منصب کے متمنی ہیں اور حکومت کو خوش کرنے کے لئے یونیورسٹی کے مفاد پر ضرب لگا رہے ہیں، وائس چانسلر کے بعض بیانات کو جن کی وہ تردید کرتے رہے ہیں طلبہ کے اشتعال اور ردِ عمل کا باعث بتایا جاتا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے بحران کو ختم کرنے کے لئے ایکشن کمیٹی اور بعض مسلم تنظیمیں دہلی میں ایک اجلاس کرنے والی ہیں جو ان سطور کی اشاعت تک ہو چکا ہوگا۔ لیکن کیا ساری خرابیوں کے ذمہ دار صرف وائس چانسلر ہیں اور یونیورسٹی سے متعلقہ دوسرے افراد بالکل بے قصور ہیں، آخر کس کی بے ہودگی اور شر پسندی سے یونیورسٹی بند ہوئی، کس کے زد و کوب اور شورش کی وجہ سے یونیورسٹی کا نظام مفلوج ہوا، کس کی من مانی اور سفیہانہ حرکتوں سے تشدد کے اتنے سنگین واقعات رونما ہوئے، کس کی توڑ پھوڑ سے یونیورسٹی کی املاک اور قیمتی اثاثے برباد ہوئے۔ یہ طلبہ ہی تو تھے جن کے جنون، اشتعال، برہمی اور جارحیت نے ساری آفت ڈھائی۔ ان کے ان غیر شریفانہ، غیر مہذب اور وحشیانہ افعال پر قوم کے بہی خواہوں اور ملت کے دردمندوں کے سر شرم سے جھک گئے، کیا طلبہ

جس مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہیں اس میں ان کی ان نا روا حرکتوں کا کوئی جواز ہے؟

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وائس چانسلر بے داغ ہیں، ان صفحات میں ان کی آمریت، سخت گیری، بے لچک رویے اور اپنے ماتحتوں کو نظر انداز کرنے کا ذکر آچکا ہے، بلکہ دکھانا یہ ہے کہ یونیورسٹی جن عناصر کا مجموعہ ہے ان میں طلبہ کی یہ کارستانیاں ہیں، ان کی ناراضگی اور شکایتیں درست ہو سکتی ہیں مگر ان کا غیر ذمہ دارانہ، جارحانہ اور ناعاقبت اندیشانہ رویہ سخت مذموم ہے، یونیورسٹی کے ایک اور اہم عنصر اسٹاف ایسوسی ایشن کے بارے میں خبر آئی تھی کہ وائس چانسلر اور انتظامیہ سے نجی شکایتوں کی بنا پر اس نے تشدد کو ہوا دی اور طلبہ کو اکسایا، اس لئے صرف وائس چانسلر کو برخاست کرنے کا مطالبہ اور دوسرے عناصر کے جراثیم کو بڑھنے اور پھیلنے دینا کیسے مناسب ہے۔ یونیورسٹی کا قضیہ بازاروں اور سڑکوں میں لے جانے سے اس کی جگ ہنسائی اور ہوا خیزی ہوگی۔ اصلاح و مصالحت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ یونیورسٹی سے متعلقہ لوگوں سے رابطہ قائم کرکے اصل حقائق معلوم کئے جائیں اور ان کی روشنی میں گفت و شنید کی جائے شور و ہنگامہ کے بجائے افہام و تفہیم ہی سے یونیورسٹی کے معاملات درست ہو سکتے ہیں۔

مرکزی وزیر داخلہ عربی مدارس کو آئی۔ ایس۔ آئی کا اڈا کہہ کر ابھی خاموش نہیں ہوئے تھے کہ اترپردیش کی بی۔ جے۔ پی حکومت نے مذہبی اداروں اور عمارتوں کی تعمیر ہی پر پابندی کا بل منظور کر دیا جو ملک کے دستور کے خلاف اور اقلیتوں کے معاملات میں بے جا مداخلت ہے، دستور نے انہیں اپنے مذہب پر عمل اور اپنی پسند کے ادارے قائم کرنے اور چلانے کی آزادی دی ہے، لیکن اس بل کے ذریعہ حکومت ان کا یہ حق غصب کرنا چاہتی ہے اور ملک سے جمہوریت اور سیکولرزم ختم کرکے اسے فسطائیت کے راستے پر ڈالنا چاہتی ہے، اس معاملے میں اپوزیشن پارٹیوں کا رویہ بھی تکلیف دہ اور قابلِ شکایت ہے جس کی بنا پر یہ بل آسانی سے منظور ہو گیا، بی۔ جے۔ پی کی حلیف پارٹیاں تو اس کا ضمیمہ ہیں ان کو

اپنی وزارت سے سروکار ہے، ان سے یہ توقع بےکار ہے کہ وہ بی۔ جے۔ پی کو اس کے خفیہ ایجنڈے پر عمل کرنے سے باز رکھیں گی۔ لیکن سیکولر جماعتیں جو اقلیتوں کے ووٹوں کی خواست گار رہتی ہیں ان کے خلاف ہونے والے اقدامات کے وقت خاموش اور تماشائی بن جاتی ہیں، حکومت کا یہ فیصلہ اقلیتوں کے لئے ناقابلِ قبول ہے، انہیں اپنی متفقہ حکمت عملی وضع کرکے حکومت کو اپنا جابرانہ، نامنصفانہ اور غیرآئینی بل واپس لینے کے لئے مجبور کردینا چاہئے۔

حکومت ہند کی وزارت ماحولیات وجنگلات نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور معروف سائنس داں پروفیسر شمیم جے راج پوری کو پہلے جانکی امل ایوارڈ برائے ٹکسانومی اور حیاتیاتی اقسام کے لئے منتخب کیا ہے، حکومت نے پچاس ہزار روپے پر مشتمل یہ ایوارڈ اسی سال قائم کیا تھا جو ۲۹ دسمبر کو وزیر ماحولیات نے نئی دہلی کی ایک تقریب میں انہیں تفویض کیا، اس کے لئے حکومت قابل تحسین ہے۔ ہم پروفیسر شمیم اور اردو یونیورسٹی کو مبارک باد دیتے ہیں۔

عالم اسلام کے نامور عالم، ندوۃ العلماء کے ناظم اور دارالمصنفین کے روح رواں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا ماتم اس وقت پوری دنیا میں بپا ہے

وما کان قیس ھلکہ ھلک واحد ولکنہ بنیان قوم تھدما

ہم کو نہایت افسوس ہے کہ اس شمارے میں ان پر ماتمی مضمون اور دوسری تحریروں کو شایع کرنے کی گنجایش نہیں نکل سکی۔ اگلے شمارے میں انشاء اللہ اس کی پوری تلافی کی جائے گی اور آیندہ بھی حضرت مولانا اور ان کی گوناگوں عظیم الشان اصلاحی، دعوتی، علمی، دینی، ادبی اور قومی و ملی خدمات کا وقتاً فوقتاً تذکرہ ہوتا رہے گا۔ ان کی وفات کا غم ان کے قدردانوں کے دلوں سے مدتوں محو نہیں ہوسکے گا۔

مقالات

فہم قرآن کے لئے عربی زبان کی تعلیمی اہمیت وضرورت

از ڈاکٹر حافظ عبدالرحیم *

علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے۔ خصوصاً الہامی علم جو عربی زبان ہی میں ہے اور جسے عربی زبان سیکھے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس زبان پر دسترس حاصل کرلینے سے براہ راست اس علم تک رسائی ممکن ہوجاتی ہے۔ الہامی علم یعنی قرآن وحدیث جو عربی ہی میں ہے۔ عربی زبان میں مہارت پیدا کرنے کے بعد بآسانی براہِ راست سمجھے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کے علمی موضوعات اور فقہی مسائل کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک ہے۔ اس نے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً انبیاءؑ بھیجے اور انہیں لوگوں کی رشد وہدایت کے لئے مقدس آسمانی کتابیں بھی عنایت کیں تاکہ لوگ شریعت کے مطابق عمل پیرا ہوں۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے آخری نبی "خاتم النبیین" حضرت محمد مصطفیٰؐ کو مبعوث فرمایا اور آپؐ پر اپنی عظیم الشان کتاب نازل فرمائی جو عربی زبان میں ہے کیونکہ ہمارے نبی کریمؐ کی اور جہاں آپ کی بعثت ہوئی تھی۔ وہاں کے لوگوں کی زبان عربی ہی تھی تاکہ لوگ اپنی زبان میں قرآن پڑھ سکیں اور اس کے معانی ومفاہیم کو جان سکیں اور قرآنی تعلیمات پر عبور حاصل کرنے کے بعد ان پر عمل پیرا ہوں اور اپنی دنیوی اور اخروی زندگی سنوار سکیں۔

قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے عربی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ علامہ ابن تیمیہ عربی زبان کی اہمیت

---

* شعبہ عربی جامعہ زکریا۔ ملتان پاکستان۔

ضرورت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"جان لیجئے کہ عقل، اخلاق اور دین پر عربی زبان کا بہت گہرا اثر ہے اور اسی سے صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کے ساتھ مشابہت پیدا ہوتی ہے اور ان کے ساتھ مشابہت سے عقل، دین اور اخلاق میں اضافہ ہوتا ہے۔ عربی زبان بذات خود دین ہی ہے اور اس کا جاننا فرض ہے۔ کیونکہ قرآن و حدیث کا سمجھنا فرض ہے اور یہ عربی کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے۔ یہ ایسا فرض جو اس زبان کی تحصیل کے بغیر ادا نہیں ہوتا ہے"[1]

امام ابن تیمیہؒ حضرت عمر بن یزیدؓ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا "امابعد! حدیث میں سمجھ بوجھ پیدا کرو اور عربی میں بھی سمجھ بوجھ پیدا کرو۔ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے عربی گرائمر سیکھو کیونکہ یہ عربی میں سے ہے"۔

اسی طرح حضرت عمرؓ کی روایت نقل کرتے ہیں: "عربی زبان سیکھو کیونکہ یہ تمہارے دین سے ہے اور فرائض کا علم حاصل کرو۔ کیونکہ یہ تمہارے دین سے ہے"[2]

فہم قرآن فہم قرآن سے مراد یہ ہے کہ انسان مجتہدانہ طور پر قرآن سے احکام کا استنباط کر سکے اور قرآن کریم کی کسی آیت کو پڑھ کر اس کے حقیقی مفہوم کا تعین کر سکے۔ اس کے معیار بلاغت اور کلام کے مقتضیٰ کو بھی سمجھ سکے اور اس بات پر بھی غور کرے کہ قرآن کس چیز پر زیادہ زور دیتا ہے اور اس کی اصل روح کیا ہے؟

فہم قرآن کے لئے خاص شرائط و آداب ہیں جب تک کسی میں یہ نہ پائے جائیں اس وقت تک وہ فہم قرآن کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ فہم قرآن کے لئے عربی زبان کا سیکھنا ضروری ہے۔ علامہ ابن خلدون فہم قرآن کے لئے عربی زبان کی تعلیم کی تاکید بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"قرآن عربی زبان میں ہے اور عربی کے چار رکن (علامت) ہیں۔ اہل شریعت کے لئے

ان چاروں میں مہارت حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ شرعی احکام کا ماخذ قرآن و حدیث ہی ہے اور یہ دونوں عربی میں ہیں، ان کے راوی جو صحابہؓ اور تابعینؒ ہیں وہ عرب ہیں۔ وہ مشکل مسائل کی تشریح بھی عربوں ہی کی زبان کے ذریعہ کرتے ہیں اس لئے جو علم شریعت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ان علوم کا جاننا نہایت ضروری ہے جن کا تعلق عربی زبان سے ہے پھر ان علوم میں اہمیت کے اعتبار سے بھی تفاوت ہے جس علم شریعت کو جتنا زیادہ لگاؤ ہے وہ اسی قدر زیادہ اہم ہے ... ان علوم میں سب سے زیادہ اہم اور مقدم علم نحو ہے کیونکہ مقاصد پر دلالت و رہنمائی کے قواعد نحو ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے عبارت کے سمجھنے کا انتہائی گہرا تعلق ہے ..."[3]

علوم عربیہ جن کے بغیر عربی پر عبور حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ ہیں :

۱۔ **علم نحو** : معنی کی تبدیلی اور اس کا اختلاف اعراب کے اختلاف و تبدیلی سے وابستہ ہے۔ یعنی لفظوں کی حرکات کے بدلنے سے معنی میں تبدیلی آجاتی ہے۔ لہٰذا عربی کی تعلیم میں اس کا اعتبار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

۲۔ **علم صرف** : اسی طرح علم صرف کی اہمیت ہے، اس علم سے لفظوں کی بناوٹ اور صیغوں کا علم حاصل ہوتا ہے۔ ابن فارسؒ کا قول ہے کہ جس شخص سے صرف کا علم فوت ہو گیا اس کے ہاتھ سے ایک عظیم الشان چیز جاتی رہی۔ مثلاً "وجد" ایک مبہم لفظ ہے جب ہم اس کی گردان کریں گے تو وہ اپنے مصدروں سے واضح ہو جاتا ہے۔ امام زمخشریؒ کا قول ہے کہ جس شخص نے قرآن کریم کی اس آیت "يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ"[4] کی تفسیر کرتے ہوئے کہا کہ یہاں لفظ "امام" ام کی جمع ہے اور قیامت کے دن لوگ اپنی ماؤں کے نام سے منسوب کر کے پکارے جائیں گے اور ان کے باپ کا نام نہ لیا جائے گا تو یہ قول تفسیر

کی بدعتوں میں سے ہے اور یہ ایسی غلطی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قائل علم صرف سے بالکل ناواقف ہے۔ اس لئے کہ علم صرف کی رو سے ام کی جمع "امام" کے وزن پر آہی نہیں سکتی[۵]

۳۔ علم لغت: مشکل الفاظ کی تشریح اور ان کے مدلولات حسب وضع اسی علم کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں۔ جب معانی میں خلط پیدا ہونے لگا اور کثرت سے عربی الفاظ اپنے حقیقی معنی کی بجائے دوسرے معنوں میں استعمال ہونے لگے تو یہ علم وجود میں آیا۔ مجاہدؒ کا قول ہے کہ کسی ایسے شخص کے لئے جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ بات حلال نہیں کہ عربی لغات میں مہارت کے بغیر کتاب اللہ کے بارے میں کچھ کلام کرے[۶]

۴۔ علم بلاغت: اس کی تین قسمیں ہیں:

ا۔ علم معانی: وہ علم ہے جس میں ان ہیئتوں اور حالتوں کے بارے میں بحث کی جاتی ہے جو الفاظ کے ساتھ مقتضائے حال کے مطابق ہوں۔

ب۔ علم بیان: وہ علم ہے جس میں لفظ کے لازم و ملزوم اور اس کے حقیقی و مجازی معنوں کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔ نیز استعارات و کنایات اور تشبیہات وغیرہ کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔

ج۔ علم بدیع: وہ علم ہے جس سے کلام میں زینت اور حسن پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے اور کلام میں یہ خوبصورتی یا تو مقفی عبارت کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے یا ہم جنس کلام کے ذریعہ[۷]

۵۔ علم ادب: ادب عربوں کے اشعار و اخبار کے حفظ کرنے کا اور ہر علم سے اہم معلومات حاصل کرنے کا نام ہے۔ یعنی علوم لسانیہ اور علوم شرعیہ کی ضروری معلومات بہم پہنچانا جس میں قرآن و حدیث کی معلومات کا زیادہ حصہ ہے۔

زبان سے متعلق علوم و فنون کے علاوہ تاریخ، سیرت، قصے، کہانیاں اور انساب کو ادب کے دائرے میں شامل کر لیا گیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آپؓ سے پوچھا کہ قرآن کا کون سا علم افضل ہے۔ آپؓ نے جواب میں فرمایا اس کی عربیت (عربی زبان و علوم)، تو اس کو عربی شاعری میں تلاش کرو[۸]

عربیت کا ذوق

مذکورہ بالا علوم کے علاوہ فہم قرآن کے لئے عربیت کا ذوق بھی نہایت ضروری ہے اور یہ ذوق عرب ادیبوں کے کلام بغور پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی ذوق کے ذریعہ عربی کلام کے مدلول و منطوق کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے اور الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ عربیت سے مراد عربی زبان کی صرف اتنی استعداد نہیں ہے کہ کوئی شخص عربی سے اردو میں یا کسی اور زبان میں ترجمہ کر سکے۔ صرف اتنی استعداد سے وہ قرآن مجید کی اجمالی مراد تو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن جب تک اس کا ذوق عربیت پختہ نہیں ہوگا اور بقول امام شافعیؒ جب تک اس میں کسی عربی عبارت کو عربی کے ہی انداز فہم و تعبیر کے مطابق سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی۔ وہ قرآن مجید کے بلیغ اسلوب بیان اور اس کے مخصوص طریقۂ تعبیر سے واقف نہیں ہو سکے گا اور اس بنا پر قرآنی مفہوم و مطلب کے بہت سے گوشے اور پہلو ایسے ہوں گے جو اس کی عقل و فہم کی گرفت میں نہ آ سکیں گے۔

فہم قرآن کے لئے صرف عربی دانی کافی نہیں بلکہ عربیت کا ذوق سلیم درکار ہے یہ ذوق پیدا کرنے کے لئے بڑی ممارست اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ صاحب ذوق کو عربی کلام پڑھتے وقت وہی لذت و سرور حاصل ہو جو اس کو خود اپنی زبان کا اچھا شعر

سن کر حاصل ہوتا ہے۔ وہ عربی کے تمام محاورات ان کے استعمال کے مواقع سے پورا واقف ہو ایک مفہوم کو مختلف طریقہ ہائے بیان سے واضح کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہو، وہ یہ بھی جانتا ہو کہ ایک طریقۂ بیان کو دوسرے طریقۂ بیان پر کیا فوقیت حاصل ہے

خلاصہ یہ ہے کہ ذوق صحیح سے مراد یہ ہے کہ ائمہ عرب کے کلام کی ممارست اور مشق سے ایک ایسا پختہ ذوق پیدا ہو جائے کہ وہ عربی کلام کے مدلول و منطوق کو پوری طرح سمجھ سکے، اس کے اشارات و کنایات سے واقف ہو جائے، الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کر سکے اور صرف یہی نہیں بلکہ فصیح و بلیغ کلام سن کر محظوظ اور لطف اندوز ہو اور پست اور برے کلام سے اس کے ذوق کو صدمہ پہنچے اور اس کی طبیعت میں انقباض پیدا ہو۔ یہ ذوق، یہ ملکہ اور خداداد صلاحیت ہر ایک کے حصہ میں نہیں آسکتی۔

ائمہ مفسرین نے علوم عربیہ کو تفسیر کی تعریف میں شامل کیا ہے۔ ابو حیان اندلسی صاحب "البحر المحیط" نے فہم قرآن کے لئے علوم عربیہ کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے تفسیر کی اس طرح تعریف کی ہے:

ھو علم یبحث عن کیفیۃ النطق	تفسیر ایسا علم ہے جو الفاظ قرآن کی
بالفاظ القرآن و مدلولاتھا	کیفیتِ نطق، ان کی دلالت، ان کے
واحکامھا الافرادیۃ والترکیبیۃ	افرادی و ترکیبی احکام اور ان کے ان
و معانیھا التی تحمل علیھا	معانی سے بحث کرتا ہے جو ان کی حالتِ
حالۃ الترکیب و تتمات	ترکیبی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ
لذلک۔	چند اور تتمات بھی ہیں جن کا علم مفسر
	کے لئے ضروری ہے۔ [9]

علامہ سید مرتضیٰ زبیدی اس قول کو امام غزالی کی احیاء العلوم کی شرح میں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"ابو حیان کے اس قول میں علم جنس ہے اور اس کے بعد جو قیود آئی ہیں وہ بمنزلۂ فصل ہیں چنانچہ "یبحث فیہ عن کیفیۃ النطق بالفاظ القرآن" سے مراد علم قرارت ہے۔ اور "مدلولاتھا" سے مراد ان ہی الفاظ قرآن کے مدلولات ہیں۔ اس کا مصداق علم لغت ہے جس کے بغیر الفاظ قرآن کے مدلولات کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ "احکامھا الافرادیۃ والترکیبیۃ" اس کے لئے "علم تصریف"، "بیان" اور "بدیع" کی ضرورت ہے۔ "معانیھا" سے مراد یہ ہے کہ مفسر کو معانی پر الفاظ کی دلالتِ حقیقی اور دلالت مجازی سے واقفیت ہو۔ کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ترکیب اپنے ظاہر کے اعتبار سے کسی چیز کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن اس کے لئے کوئی مانع ہوتا ہے تو اب لفظ سے کوئی معنی مجازی مراد لینے پڑتے ہیں۔ پھر آخر میں ابو حیان نے "و تتمات" جو کہا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ مفسر کو نسخ اور سببِ نزول وغیرہ کا علم ہونا چاہئے تاکہ قرآن میں جو باتیں مبہم ہیں وہ معلوم ہو سکیں" [10]

علامہ زرکشی تفسیر کے بارے میں فرماتے ہیں:

ھو علم یفھم بہ کتاب اللّٰہ	تفسیر ایسا علم ہے جس کے ذریعہ اللہ کی
المنزل علی نبیہ محمد صلی اللّٰہ	کتاب کو جو نبی پر نازل ہوئی سمجھنے،
علیہ وسلم و بیان معانیہ	اس کے معانی سے واقفیت حاصل
و استخراج احکامہ و حکمہ	کرنے اور اس میں سے حکم اور احکام
و استمداد ذلک من علم اللغۃ	کے استخراج میں مدد ملتی ہے، اس

والنحو، والتصریف، والبیان واحوال الفقہ، والقرأت ویحتاج الی معرفۃ اسباب النزول والناسخ والمنسوخ۔

مقصد کے لئے علم، لغت، نحو، تصریف بیان، فقہ، قرأت سے مدد لینا پڑتی ہے اور اسباب نزول، ناسخ و منسوخ کی معرفت کی ضرورت ہوتی ہے۔[11]

علامہ تفتازانی تفسیر کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

ھو العلم الباحث عن احوال کلام اللہ من حیث الدلالۃ علی مراد اللہ تعالیٰ۔

تفسیر ایسا علم ہے جو کلام اللہ کے الفاظ کے حالات سے بحث کرتا ہے اس حیثیت سے کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کے مراد و مقصود پر کس طرح دلالت کرتے ہیں۔

دراصل قرآن لفظ اور معنی دونوں کا نام ہے تو تفسیر وہ علم ہے جس میں علوم عربیہ (قواعد) کے مطابق نظم قرآن کے معنی سے شرعی بحث کی جائے۔ اس علم کا مقصد نظم قرآن کے معانی کو جاننا ہے۔ ذیل میں فہم قرآن کے لئے علوم عربیہ کی ضرورت سے متعلق بعض ائمہ عربیت کے خیالات پیش کئے جاتے ہیں:

۱۔ علامہ سیوطیؒ فہم قرآن کے لئے علم بلاغت اور ذوق سلیم کو ضروری قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اعجاز قرآن کا ادراک معانی و بیان میں مہارت پیدا کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ ذوق سلیم بھی ہو۔[12]

۲۔ امام ابوبکر باقلانی کا قول ہے:

من زعم انہ یمکن ان یفھم شیئا من بلاغۃ القرآن بدون ان یمارس البلاغۃ بنفسہ فھو کاذب مبطل۔

جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ وہ خود بلاغت کی مشق و ممارست کے بغیر قرآن کریم کی بلاغت کو تھوڑا بہت سمجھ سکتا ہے وہ جھوٹا اور باطل گو ہے۔

امام موصوف نے تو صرف بلاغتِ قرآن تک ہی بات محدود رکھی ہے۔ علامہ سید رشید رضا نے تفسیر المنار میں لکھا ہے کہ عربیت کے بغیر کوئی شخص قرآن مجید سے نصیحت بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ فرماتے ہیں:

"کوئی شخص قرآن سے نصیحت حاصل نہیں کر سکتا بایں طور کہ اس کا نفس قرآنی وعدوں پر مطمئن ہو جائے اور وعید سے لرز جائے جب تک کہ اس کے معانی کو سمجھنے کی اہلیت پیدا نہیں کر لیتا اور اس کے طریقہ ہائے بیان کی شیرینی محسوس کرنے نہیں لگتا۔"

۳۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر میرے پاس کوئی ایسا شخص لایا جائے جو عربی زبان سے واقف نہ ہو اس کے باوجود کلام اللہ کی تفسیر کرتا ہو تو میں اس شخص کو سزا دوں گا۔[13]

۴۔ مجاہدؒ کا قول ہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ لغات عرب کو جانے بغیر اللہ کی کتاب کے متعلق کلام کرے۔

۵۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص عربیت سے ناواقف ہے وہ بسا اوقات کوئی آیت اس طرح سے پڑھتا ہے کہ اس آیت کا لفظ اس کے لئے باعث ہلاکت بن جاتا ہے۔

۶۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اس شخص کو تفسیر بالرائے کی وعید کا مستحق بتایا ہے جو علومِ عربیت سے ناآشنا ہونے کے باوجود تفسیر کی جرأت کرتا ہے ارشاد فرماتے ہیں:

" تفسیر بالرائے کا دوسرا مصداق یہ ہے کہ کوئی شخص لفظوں کی محض ظاہری

شکل وصورت کو دیکھ کر تفسیر قرآن کی جرات کرے اور قرآن مجید میں جو مشکل الفاظ ہیں اور ان کے علاوہ جو الفاظ مبہم یا مختصر ہیں ان کے حل کرنے میں سماع اور نقل سے مدد نہ لے۔[14]

کتنے ہی ایسے الفاظ ہیں جن کے معنی نزولِ قرآن کے وقت کچھ اور تھے لیکن ایک دو صدیوں کے بعد وہ کسی اور معنی میں استعمال ہونے لگے، جو شخص فہم قرآن کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کے کسی لفظ سے وہی معنی مراد لے جو عہد نبوت میں اس سے مراد لئے جاتے تھے۔

عرب لہجات و اصوات کا علم عربیت اور اس سے متعلقہ علوم و فنون کے ساتھ فہم قرآن کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان تمام لہجوں اور آوازوں سے واقفیت پیدا کی جائے جو نزولِ قرآن کے وقت عرب میں رائج تھے۔ پھر اس بات پر غور کیا جائے کہ قرآن ان میں سے کس کس لہجہ اور آواز پر نازل ہوا ہے ورنہ اس علم کے بغیر فہم قرآن کی کوشش گمراہی کا سبب بن سکتی ہے مثلاً سورۂ نمل میں حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں ہے "اَوْلَا اَذْبَحَنَّہٗ"، جو شخص قرائے عرب کی قراءتوں اور ان کی خصوصیتوں سے واقف نہیں ہے۔ وہ اس فقرہ کا ترجمہ نفی کے ساتھ کرے گا یعنی یہ کہ "میں اس (ہدہد) کو ذبح نہیں کروں گا"، لیکن اس کے مقابلہ میں لہجات عرب سے باخبر شخص فوراً سمجھ لے گا کہ دراصل یہ "لا" لائے نافیہ نہیں ہے بلکہ لام کے فتحہ کو ذرا کھینچ دینے کی وجہ سے صورت "لا" کی ہوگئی ہے اور اسی لہجہ کے مطابق اس لفظ کی قرآن میں کتابت بھی ہوئی ہے۔

لہجہ کا اختلاف تو ایک ایسی چیز ہے کہ خود صحابۂ کرام کو بعض مرتبہ نبی کریمؐ سے اس بارے میں استفسار کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ صفوان بن عسال سے روایت ہے کہ انہوں نے

ایک مرتبہ آپؐ کو "یا یحییٰ" پڑھتے ہوئے سنا تو عرض کیا یارسول اللہ! آپؐ امالہ کر رہے ہیں، حالانکہ یہ تو قریش کا لغت نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا لیکن ان کے ماموں بنو سعد کا لغت ہے۔[15]

قرآن کے بعض الفاظ میں حرفوں کے ادا کرنے کی کیفیت میں صحابہؓ کا اختلاف جو مشہور و منقول ہے، اسے علم قرأت کہتے ہیں۔[16] قرآن کریم کے الفاظ کی نطق کی صحیح کیفیت اسی علم کے ذریعہ معلوم ہوتی اور قراتوں ہی کے وسیلہ سے احتمال وجوہ میں سے بعض کو بعض پر ترجیح ملتی ہے۔[17]

تفسیر قرآن میں اسلاف کی احتیاط جلیل القدر صحابہ اور تابعین تفسیر قرآن کے معاملہ میں بہت ہی زیادہ احتیاط کرتے تھے۔ اس سلسلے کے چند اقوال یہاں نقل کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے کہ میں نے مدینہ طیبہ کے فقہاء کو دیکھا یہ حضرات تفسیر قرآن کے سلسلہ میں گفتگو کرنے کو بڑا اہم اور ذمہ داری کا کام سمجھا کرتے تھے، سالم بن عبداللہ، سعید بن مسیب اور نافع انہی حضرات میں سے تھے۔[18]

۲۔ یحییٰ بن سعید کا قول ہے کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ سعید بن مسیب سے قرآن کریم کی کسی آیت کے بارے میں دریافت کر رہا تھا مگر انہوں نے جواب دیا میں قرآن سے متعلق کچھ نہیں کہوں گا۔[19]

۳۔ اصمعی لغت و ادب کا بہت بڑا امام تھا۔ طویل عرصہ تحقیقِ لغات، صحیح محاورات اور ان کے معانی کی فکر و جستجو میں عرب کے جنگلوں کی خاک چھانی اور لفظ لفظ کے لئے عرب کے بدوؤں میں برسوں تک قیام کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن پاک کی تفسیر کے بارہ میں بالکل خاموش رہتا تھا اگر اس سے کسی آیت کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو کہتا، عرب اس کے یہ معنی بیان کرتے ہیں، میں نہیں جانتا اس

کیامراد ہے؟" [20]

خلاصہ یہ کہ فہم قرآن کے لئے بنیادی طور پر دو چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے، ایک علوم عربیہ میں مہارت اور دوسری چیز ذوق قرآنی ہے۔ پہلی کسبی ہے اور دوسری وہبی اور خداداد صلاحیت ہے جو اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور خال خال لوگوں ہی کو میسر ہوتی ہے۔ جس طرح کوئی شخص شعروادب کے فطری ذوق اور زبان میں عبور حاصل کئے بغیر شاعروادیب نہیں بن سکتا۔ بالکل اسی طرح عربی زبان میں کمال اور ذوق قرآنی پیدا کئے بغیر فہم قرآن کا اہل نہیں ہوسکتا۔

علامہ رشید رضانے قرآن کی حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے: [21]

"اس کے حق ہونے کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا، محمدؐ نے وہ تمام قرآن لوگوں تک پہنچادیا جو آپؐ پر نازل ہوا تھا اور اس کو آپؐ نے وضاحت کے ساتھ خوب بیان کردیا۔ آپؐ نے علم دین کی کسی شئ کے ساتھ کسی کو مخصوص نہیں کیا اور نہ علم دین میں کسی کو کسی پر فوقیت ہوسکتی ہے۔ البتہ صرف فہم قرآن کی وجہ سے ایک دوسرے پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔ یہ فہم قرآن دو چیزوں سے حاصل ہوسکتا ہے انمیں ایک کسبی ہے دوسری وہبی ہے۔ دوسری قسم جو وہبی ہے، اس کی طرف حضرت علیؓ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: فہم قرآن ایک خاص نعمت ہے، جس سے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں ہی کو نوازتا ہے۔ رہی دوسری قسم تو اس کی وجہ سے ہی علوم کسبیہ میں مہارت رکھنے والے علماء ایک دوسرے پر باہمی نفضیلت وبرتری رکھتے ہیں مگر جو شخص علم عربیت سے ناآشنا اور سنن وآثار سے ناواقف ہو اس کو علم وہبی سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔"

حواشی وحوالہ جات

[1] ابن تیمیہ، شیخ الاسلام: اقتضاء الصراط المستقیم... مطابع المجد التجاریۃ مکۃ المکرمۃ، ۱۳۹۰ھ ص: ۲۰۷ [2] دیکھئے حوالہ مذکور اور غزالی، امام۔ احیاء علوم الدین، دار الندوۃ الجدیدۃ، بیروت: ۱/ ۲۸۹ [3] ابن خلدون، علامہ عبدالرحمٰن، مقدمہ ابن خلدون، موسسۃ الاعلمی بیروت، فصل نمبر ۳۶، ص: ۵۴۵ [4] سورۃ الاسراء: ۱/۱۷ [5] زمخشری، الکشاف مطبوعہ قدیم۔ ۲/ ۶۸۲ [6] سیوطی، امام جلال الدین، الاتقان فی علوم القرآن، اردو ترجمہ از محمد حلیم انصاری، ادارہ اسلامیات لاہور ۱۹۸۲ء: ۲/ ۴۴۳ [7] حوالہ مذکور، مقدمہ ابن خلدون، فصل نمبر ۳۶، ص ۵۴۸ - ۵۵۳ [8] ابوحیان الاندلسی، النحوی، البحر المحیط، دار الفکر بیروت، ۱۹۹۲ء ۱/ ۲۶ [9] حوالہ مذکور: ۱/ ۲۵ [10] زبیدی، مرتضی، شرح احیاء علوم الدین۔ البابی الحلبی بمصر: ۴/ ۵۲۹ [11] اتقان: ۲/ ۴۲۶ [12] حوالہ مذکور ۲/ ۴۳۵ [13] حوالہ مذکور ۲/ ۴۳۰ [14] احیاء علوم الدین: ۱/ ۲۹۱ [15] اتقان: ۱/ ۹۱ [16] مقدمہ ابن خلدون، فصل نمبر ۳۵ [17] اتقان: ۲/ ۴۳۵ [18] طبری، ابن جریر، تفسیر الطبری ۱/ ۲۸ [19] حوالہ مذکور [20] سیوطی، امام جلال الدین، المزھر فی علوم اللغۃ وانواعھا تحقیق محمد احمد جاد وآخرون مطبعہ عیسیٰ البابی الحلبی مصر ۱۹۵۸ء ۲/ ۳۰۲ [21] سید رشید رضا علامہ، تفسیر المنار، مقدمہ دار المعارف بمصر۔

علامہ شبلی ایک مصنف گر

از جناب جمشید احمد ندوی ٭

چراغ سے چراغ جلنے کا سب سے عمدہ منظر تعلیم و تربیت کا نظام ہے۔ حجۃ الوداع کی بے مثال دستاویزی تقریر کے اس بلیغ فقرہ "الا فلیبلغ الشاھد الغائب" میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کسی بھی چیز خصوصاً علوم و فنون کو اگر آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا انتظام نہیں کیا گیا تو وہ نیست و نابود ہو جائے گی۔ خواہ اس کی بنیادیں کتنی ہی مضبوط، پائیدار اور گہری کیوں نہ ہوں۔

سلسلۂ تعلیم و تربیت دراصل الوہی سلسلہ ہے جس کی ابتدا "عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّهَا" سے ہوئی اور پھر وہ مختلف مدارج طے کرتا ہوا عہد رسالت تک جا پہنچتا ہے جہاں سے تعلیم و تربیت کا ایک زریں عہد شروع ہوتا ہے جس کی مثال مذاہب عالم میں مشکل سے ہی دستیاب ہو سکے گی۔ اسلام نے تعلیم و تربیت پر اپنے متبعین کو کچھ اس انداز سے ابھارا کہ ہر شخص نے اس میں مسابقت اختیار کرنی چاہی، نتیجتاً مختلف علوم و فنون سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے اور ان کی حفاظت کا سامان فراہم کیا جاتا رہا۔

کبارِ صحابۂ کرام نے دامن رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہی پرورش پائی اور انہوں نے اسی درسگاہ سے فیضیاب ہو کر صغار صحابہ اور تابعین کی تعلیم و تربیت کے فرائض انجام دیے جماعت

٭ سینیر ریسرچ فیلو۔ خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔

تابعین نے علم و فن کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کر کے اس مشعل کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے جانشین تبع تابعین کے حوالے کی اور اپنے فرائض سے سبکدوش ہوئے، تبع تابعین کی مقدس جماعت بھی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے علم و فن کی آبیاری کرتی رہی اور اس کی تحقیق و تلاش میں صحرانوردی اور آبلہ پائی خندہ پیشانی سے برداشت کرتی رہی۔ ان کے بعد محدثین عظام نے یہ جگہ سنبھالی جنھوں نے نہ صرف اپنے اسلاف کے گرانقدر ورثہ کو محفوظ رکھا بلکہ اسے مزید آب و تاب دی اور مسند درس کچھ اس شان سے بچھائی کہ ان میں سے ہر ایک کے سینکڑوں شاگرد پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف ان کی علمی خدمات کو زندہ رکھا بلکہ اسے آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا انتظام بھی کیا۔

صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین اور محدثین عظام کی جماعت نے فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم "الا فلیبلغ الشاھد الغائب" کی حقیقت سے واقف ہو کر آنے والی نسلوں تک اگر علوم و فنون کی منتقلی کا انتظام نہیں کیا گیا تو وہ نیست و نابود ہو جائے گا۔ اسی لئے انہوں نے علوم و فنون کو سینہ بہ سینہ منتقل کرنے کا انتظام نہایت ہی جانفشانی اور تندہی سے کیا اور اس راہ میں پیش آنے والی ساری دشواریوں کو بڑے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیا اور اپنے اس طرزِ عمل سے اپنے کو اس حدیث کا مصداق ثابت کیا جس میں انسانی گروہ کو تین طبقات میں تقسیم کرتے ہوئے اس طبقہ کو اولین مقام سے نوازا گیا جو خود بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی ذات سے دوسروں کو بھی فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

برصغیر ہند میں بھی کامل الفن اساتذہ نے ان ہی خطوط پر اپنی مسند درس بچھائی، جہاں سے علماء فضلاء تربیت پا کر کارگہ حیات میں قدم رکھتے رہے اور اپنے اپنے علاقوں میں

جاکر علم وفن کی روشنی پھیلاتے رہے، اس سلسلے میں سب سے ممتاز ولی اللہی خانوادہ ہے جس نے ہندوستان میں علوم وفنون کی آبیاری اپنے خون جگر سے کی تھی، اس خاندان کے علاوہ دوسرے بہت سے خانوادوں، اداروں اور افراد نے بھی تعلیم و تربیت کا یہ عمل جاری رکھا، تعلیم وتربیت کے اسی سلسلۃ الذھب سے علامہ شبلی (م ۱۹۱۴ء) کا بھی تعلق ہے جنھوں نے تعلیم وتربیت کے فرائض کچھ اس آب وتاب سے انجام دئے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے نصف اول تک آسمان علم وادب پر جگمگانے والے اکثر ستارے اسی مرکز ثقل سے متعلق اور اسی نظام شمسی کے اردگرد گھومتے نظر آتے ہیں، ان کی بے مثال اور منفرد مربیانہ صلاحیتوں نے علمار وفضلار اور ادبار کی ایک ایسی جماعت تیار کی جسے آج دنیا دبستان شبلی کے نام سے جانتی ہے۔

علامہ شبلی کا شمار ان نادرۂ روزگار شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے صرف تصنیف وتالیف اور علمی مشغولیات کو ہی اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا تھا، بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو انھوں نے اپنی سحر انگیز شخصیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے خوردوں کی تعلیم خصوصاً تصنیف وتالیف کی تربیت اور علمی ذوق کو پروان چڑھانے، ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو نکھارنے اور ان کی شخصیات کو جلا بخشنے کا بھی قابل قدر کارنامہ اپنے بلند پایہ اسلاف کی طرح انجام دیا، اس سلسلہ میں وہ اپنے دور کے علمار وفضلار کے گروہ میں علانیہ ممتاز نظر آتے ہیں۔

علامہ شبلی کی شخصیت کا یہ گرانقدر پہلو اور امتیازی خصوصیت سرسید کی علمی وعملی تربیت کا نتیجہ تھا، انھوں نے ہی علی گڑھ کے قیام کے دوران علامہ شبلی کے دل میں اپنے طرز عمل سے یہ داعیہ وجذبہ پیدا کر دیا تھا کہ کاروان علم وادب کو آگے بڑھانے، اسلاف کے کارناموں کو دوام بخشنے اور دوسروں کے دلوں میں علم کی جوت جلانے کے لئے شاگردوں اور تلامذہ کی علمی دینی تصنیفی اور تالیفی تربیت ضروری ہے۔

علامہ شبلی کے شخصیت ساز ہونے کی وجہ سے علمار، ادبار اور مصنفین کی ایک ایسی جماعت تیار ہوئی جنھوں نے علم وادب کے مختلف پہلوؤں خصوصاً اسلام کے متعلق پیدا شدہ غلط فہمیوں کے ازالہ اور سدباب کا قابل قدر کارنامہ انجام دیا، اس طرح ان کا وہ خواب مکمل طور پر نہ سہی کسی حد تک ہی شرمندۂ تعبیر ہوا جو انہوں نے اردو زبان میں مختلف علوم وفنون، اسلامی ادب اور اسلام کے مختلف پہلوؤں کے متعلق ایک قابل قدر تحریری سرمایہ کی فراہمی کے متعلق دیکھا تھا[1] جس کی تکمیل کے بعد ہی انہوں نے ازلی قانون کے مطابق داعی اجل کو لبیک کہہ دیا، لیکن ان کے لگائے ہوئے پودے تناور درختوں میں تبدیل ہوگئے اور ان پر کچھ اس طرح ٹوٹ کر ثمر آئے کہ ہندوستان کی علمی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر مرتب ہی نہیں ہوسکتی درج ذیل سطور میں ہم علامہ کے اسی پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں گے جس نے انہیں ایک ایسے علمی نظام شمسی میں تبدیل کر دیا تھا اور جس کی کشش ثقل سے چھوٹے کیا بڑے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔

علامہ شبلی کی شخصیت کا جائزہ لینے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دیگر خصوصیات کے ساتھ ایک خاص قسم کی کشش وسحر انگیزی بھی عطا کی تھی، چنانچہ جو بھی ان سے ملتا وہ ان کا گرویدہ ہوجاتا تھا جس کی بنیادی وجہ ان کی شفقت ومحبت، نرم خوئی، ہمدردی تعلیم وتربیت پر توجہ اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے جذبے کے ساتھ ہر ایک کے ساتھ یکساں برتاؤ اور سلوک تھا، ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ وہ مجھ سے ہی زیادہ محبت کرتے ہیں[2] اس لئے وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا، خصوصاً طلبہ کی نظروں میں تو ان کے سوا کوئی اور جنچتا ہی نہیں تھا۔ ان کے تئیں طلبہ کا جذبۂ عقیدت وشیفتگی اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ وہ ان کی برہمی وغصہ کو بھی اپنے حق میں ان کی محبت کا ہی مظہر سمجھتے تھے اور ان پہ نثار ہونے

کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے[۳۵] اس ساحرانہ کشش کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک جوہری کی پرکھ سے بھی نوازا تھا اور وہ طلبہ میں سے جوہر قابل کو پہچان لیتے تھے پھر ان کی شخصیت کی تراش و خراش کچھ اس طرح کرتے کہ ان کے جوہر مزید جلا پاتے اور ان کی خوابیدہ صلاحیتیں پروان چڑھنے لگتیں اور وہ اس پارس سے مس ہوتے ہی کندن بن جاتے۔

علامہ کی اس علم پروری، خورد نوازی، جوہر شناسی اور پرورشِ لوح و قلم کے نتیجہ میں نہ جانے کتنے لوگ پروان چڑھے اور علم و ادب کے خدمت گزار اور سلطنت فن کے تاجدار بنے۔ لہٰذا ہم یہ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنی معلمانہ لیاقتوں اور مربیانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اہلِ قلم، علمار و فضلار کی ایک اہم اور قابل قدر جماعت تیار کر دی جنہوں نے علم و فن کے میدان میں گرانقدر خدمات انجام دیں جن سے صرف نظر ممکن نہیں مگر افسوس کہ ایسے نادر جوہری اور عظیم مربی کی ہمدردانہ تعلیم و تربیت سے ان کے بہت سے معاصرین، تلامذہ اور اصحاب نے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ بایں ہمہ جن تلامذہ و اصحاب نے علامہ شبلی سے کسب فیض کیا وہ جہانِ علم میں تابندہ اور درخشندہ بنے اور جانشینیِ استاد کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ ان کے عظیم ترین شاگرد اور ایک معنی میں جانشین و وارث علمی سید سلیمان ندوی کا مشاہدہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد یہ قرار دیا تھا کہ وہ اپنے سامنے اور اپنے بعد بھی علمار کا ایک ایسا گروہ چھوڑ جائیں جو اس نئے زمانے میں اسلام کی ایک نئی ضرورت (اسلام کی مدافعت) کو پورا کرتا رہے[۳۶] علامہ اپنے اس مقصد میں مکمل طور پر نہ سہی کسی حد تک ضرور کامیاب رہے کہ ان کے شاگردوں نے اسلام کی مدافعت بلکہ اس کی حقانیت کو سامنے لانے والا ایک معتدبہ لٹریچر فراہم کر دیا۔ علامہ شبلی تعلیم و تربیت کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ ان میں طلبہ کی نفسیات کو سمجھنے کا زبردست

مادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کو زجر و توبیخ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کبھی ان کی خامیوں و خوبیوں کو نمایاں کرتے ہیں، کبھی عبدالسلام ندوی اور ضیار الحسن ندوی کی ہمت افزائی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں غرضیکہ وہ تعلیم و تربیت کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

علامہ شبلی کی اس خصوصیت کا اعتراف مختلف اصحاب علم و فضل نے کیا ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی فرماتے ہیں "مجھ کو بھی اگر کچھ لکھنا آیا تو ان ہی صحبتوں کے اثر سے، تاریخ و ادبِ فارسی کا ذوق یہیں نشو و نما پایا ہے"[۳۷] مولانا عبدالماجد فرماتے ہیں "جو ان کی صحبت میں اٹھا بیٹھا وہ خود بھی اگر مصنف نہیں تو مضمون نگار تو بن ہی گیا[۳۸] اس بے علمے کو تو جو کچھ الٹا سیدھا لکھنا لکھانا آیا وہ اسی آستانہ کا فیض ہے"[۳۹] شیخ محمد اکرام کے بقول "قوم کی علمی خدمت کے علاوہ الندوہ نے ہونہار طلبہ کو موقع دیا کہ وہ تحریر و تصنیف کی ابتدائی منزلیں ایک کہنہ مشق اور کامل الفن استاد کی نگرانی میں دار العلوم کے قیام ہی میں طے کریں"۔ علی گڑھ کے دور کے ان کے شاگرد مسعود علی محوی نے اپنے مجموعہ نظم فارسی "نذر عقیدت" مطبوعہ ۱۹۵۶ء کے مقدمہ میں مولانا مرحوم کے فیضان صحبت اور فیض تعلیم و تربیت کا اعتراف یوں کیا ہے "مولانا مرحوم ان نادر الوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دیتے بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دلچسپی پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے تھے"۔ ان ہی کا بیان ہے کہ مولانا کی صحبت سے ان کے علاوہ اس کلاس کے دیگر طلبہ بھی شعر کہنے لگے تھے[۴۰]

علامہ شبلی کی تربیت گاہ میں جن اہل قلم کی پرورش ہوئی ان کی جامع فہرست تیار کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی "..... اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ

وہ مصنف گر تھے، ایک مجسم ٹکسال تھے جس سے مصنف اور اہل قلم ڈھل ڈھل کر نکلتے رہے، جن لوگوں کو ان کی اتالیقی اور دست شفقت نے تصنیف و تالیف کی اونچی کرسی تک پہنچادیا ان کی مکمل فہرست کوئی تیار کرنا چاہے تو اسے خاصی طوالت سے کام لینا پڑے گا۔[۹]

تاہم حیات شبلی، مکاتیب شبلی وغیرہ میں ان کے عظیم ترین شاگردوں کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے جن میں سے بعض ان کے زمانے ہی میں آسمان علم وادب پر چمکنے لگے تھے۔ ان میں علامہ حمید الدین فراہی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، ضیاء الحسن ندوی، شبلی ندوی متکلم، مولوی مسعود علی ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبداللہ عمادی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد علی جوہر، عبدالباری ندوی، اکرام اللہ خاں ندوی، سید ظہور احمد وحشی، حاجی معین الدین ندوی، مولوی سید ابوظفر ندوی، پروفیسر عبدالوُجد، اقبال احمد سہیل، مولانا محمد عمر، مولانا محمد سمیع، اکبر صاحب، عثمان صاحب، ماجد علی، بہادر علی، داؤد بھائی، سید سجاد حیدر، عزیز مرزا، خواجہ غلام الثقلین، مولوی عبدالحق، سید میر محفوظ علی، شیخ محمد عنایت اللہ ظفر علی خاں، ہدایت اللہ، خوشی محمد خاں ناظر، ولایت اللہ، جواد علی خاں، مسعود علی محوی، مفتی محمد یوسف، قمرالدین اعظمی، عبدالرحمٰن نگرامی ندوی، ابوالحسنات ندوی، نذیر احمد بی۔اے، کنور عبدالکریم، حسرت موہانی، مولوی محمد حسن اعظمی، سید نجم الہدیٰ دیسنوی وغیرہ جیسے اصحاب علم وکمال کے اسمائے گرامی کا پتہ چلتا ہے۔ جن میں سے اکثر نے اپنے سارے علمی کمالات کا منبع شبلی گرامی کو قرار دیا ہے۔

یہ فہرست تو صرف ان اشخاص کی ہے جو براہِ راست یا بالواسطہ شاگردی اختیار کرکے ان کی ذات سے علمی فائدہ اٹھاتے رہے۔ ان حقیقی شاگردوں کے علاوہ ان کے روحانی شاگردوں کی ایک طویل ترین فہرست ہے جس کو دنیائے علم وادب دبستان شبلی کے

نام سے جانتی ہے۔

علامہ شبلی کے شاگردوں کی فہرست پر نظر ڈالنے سے ہی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس میں مختلف علوم وفنون کے مہ وانجم اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہے ہیں جن کے علمی کمالات اور تصنیفی کارناموں میں علامہ شبلی کی ہمہ گیر اور جامع کمالات شخصیت کی روح کارفرما اور جلوہ گر ہوتی ہے۔

آئیے دیکھیں کہ علامہ کی تعلیم وتربیت کا کیا طریقہ کار تھا اور وہ کس طرح طلبہ کو تراش خراش کرکے اس طرح جوہر قابل بنادیتے تھے کہ خود انہیں بھی اپنی ذات میں ہونے والی تبدیلیوں کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ اپنی گوناگوں علمی، تعلیمی اور قومی مصروفیات کے باوجود کیونکر طلبہ اور شاگردوں کی تربیت کے جان گسل فرائض سے اس خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہوتے تھے۔

علامہ شبلی اپنی زندگی کے ہر دور میں طلبہ کی تعلیم وتربیت کرتے اور ذروں کو آفتاب و ماہتاب بناتے رہے لیکن اس کا پختہ خیال مارچ ۱۹۱۰ء میں آیا کہ انہوں نے کتب خانہ کی ضرورت واہمیت پر تقاریر کرنے کے علاوہ دارالعلوم کی سہ سالہ رپورٹ میں لکھا "یہ تجویز کہ ندوہ میں ایک دائرۂ تالیف قائم کیا جائے جس کے ارکان کا کام صرف مطالعہ کتب اور تصنیف وتالیف ہو جس طرح یورپ میں اکیڈمیاں ہوتی ہیں۔ یہ بھی اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کردیا جائے۔"[۱۰]

اتفاق سے اسی سال اگست میں نواب مزمل اللہ خاں نے سرکاری خطاب پانے کی خوشی میں جب علامہ کی تصانیف کی یادگار میں دارالعلوم میں ایک کمرہ بنوانے کی خواہش ظاہر کی تو اس کے جواب میں انہوں نے لکھا "ہم یہ چاہتے ہیں کہ دارالعلوم میں ایک عما۔

کے نام سے تعبیر ہو جس کا یہ مقصد ہو کہ اس میں تالیف و تصنیف کا ایک دفتر ہو اور اس سے باقاعدہ تصانیف شایع ہوں "[11]

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں ندوہ ہی میں طلبہ کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک مرکز قائم کرنے کا داعیہ مکمل طور پر پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ علامہ کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا ندوہ کے اختلاف نے سنگین شکل اختیار کر لی اور بالآخر جولائی ۱۹۱۳ء میں انہوں نے ندوہ سے علحدگی اختیار کر لی اور ندوۃ العلماء کے احاطہ میں دارالمصنفین کے قیام اور طلبہ کی تربیت کے لئے ایک مرکز کے قیام کا خواب خواب پریشاں بن کر رہ گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی یہ خیال ان کے دل و دماغ سے مٹا نہیں بلکہ مزید جڑ پکڑتا رہا، جس کا اندازہ مولانا کے ان خطوط سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے دارالمصنفین کے متعلق اپنے بعض معاصرین، دوستوں اور شاگردوں کو لکھے تھے[12] لہذا انہوں نے اس کی تکمیل کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی، اس کے لئے مالی وسائل اور جگہ وغیرہ کا انتظام کر لیا[13] اور اللہ کا نام لے کر اس کی بنیاد ڈال دی، لیکن ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ علامہ کا وقت موعود آ گیا اور وہ اپنے تمام منصوبوں کو اپنے عزیز شاگردوں کے حوالے کر کے اپنے حقیقی رب سے جا ملے۔

علامہ شبلی نے اپنے ذہن میں دارالمصنفین کا ایک وسیع خاکہ بنایا تھا۔ سید صاحب نے حیات شبلی میں لکھا ہے کہ علامہ کے نزدیک صرف مصنفین ہی نہیں بلکہ طلبہ کی بھی تربیت مقصود تھی، اسی لئے انہوں نے وہاں درجۂ تکمیل[14] اور درجۂ تصنیف الگ الگ قائم کیا تھا اور دونوں میں داخلہ کے لئے الگ الگ شرائط رکھی تھیں، علامہ کے اس منصوبے کی تفصیلات حیات شبلی سے نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ مدت تعلیم: دو سال، ۲۔ اس کی دو شاخیں ہوں گی: تکمیل و تصنیف، ۳۔ ہر طالب العلم

جو صرف و نحو کافی جانتا ہو اس درجہ میں داخل ہو سکے گا۔ ۴۔ اس درجہ میں داخل ہونے کے لئے ایک سرسری امتحان لیا جائے گا۔ درجۂ تکمیل: اس درجہ میں دو مضمون لازمی ہوں گے۔ ادب اور علوم ثلثہ میں سے کوئی ایک یعنی قرآن مجید مع تفسیر، حدیث، علم کلام مع فلسفہ

درجۂ تصنیف (۱) اس میں وہ شخص شامل ہوگا جس کو انشا پردازی کا فی الجملہ مذاق ہو اور عربی صرف و نحو کافی جانتا ہو اور ادب میں معمولی استعداد رکھتا ہو۔ (۲) اگر کوئی شخص عمدہ انشا پرداز ہو لیکن عربی زبان سے ناواقف ہو تو اس کو موقع دیا جائے گا کہ عربی زبان حاصل کر سکے۔

طریقہ تعلیم فن تصنیف: (۱) پہلے چھوٹے چھوٹے علمی عنوان دئے جائیں گے اور مضامین لکھوائے جائیں گے (۲) پھر چھوٹے چھوٹے علمی رسالے لکھوائے جائیں گے (۳) ہر مضمون کے متعلق اس کے ماخذ بتائے جائیں گے اور تمام ماخذ مہیا کر دئے جائیں گے کہ مطالعہ کر سکے (۴) پھر جو (یونہی یہ عبارت ناتمام رہ گئی)"[15]

دارالمصنفین کے اس تعلیمی خاکہ کے ساتھ ساتھ انہوں نے طلبہ کے داخلہ کے لئے کچھ شرائط ایسی بھی رکھی تھیں جن کا تعلق کردار سے ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے طلبہ کے متعلق مولوی مسعود علی صاحب کو لکھا کہ درجۂ تکمیل یا تصنیف والوں کے متعلق نقشہ ذیل کی خانہ پری کر کے بھیج دو۔

۱۔ نام اور پتہ یعنی سکونت وغیرہ ۲۔ مستطیع ہیں یا غیر مستطیع ۳۔ کس فن کی تکمیل چاہتے ہیں۔ سردست صرف تفسیر اور ادب کی تکمیل کا انتظام ہو سکتا ہے ۴۔ کتنی مدت تک قیام کریں گے۔ ۵۔ مقصد زندگی کیا ہے ۶۔ وضع و لباس و فرائض میں علماء کی وضع کے پابند رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ گو یہ جزئی بات ہے لیکن میں شروانی اور بوٹ تک کو ناپسند کرتا ہوں، قص لحیہ تو سخت ناگوار ہے میں صرف تعلیم نہیں بلکہ تربیت بھی چاہتا ہوں، ایسے لوگ درکار ہیں جن کی صورت اور سیرت دونوں عالمانہ ہو۔

علامہ شبلی نعمانی نے علی گڑھ اور ندوۃ العلماء میں بھی خاص خاص طلبہ کو درس دینے کا کام انجام دیا ہے علی گڑھ کے زمانہ معلمی کے متعلق بہت زیادہ معلومات فراہم نہیں ہوتی ہیں تاہم مسعود علی محوی کے قول کے مطابق وہ طلبہ میں متعلقہ مضامین سے دلچسپی پیدا کردینے کا ملکہ رکھتے تھے، علی گڑھ کی فضاء کو علمی و تعلیمی بنانے میں بھی ان کا نمایاں حصہ رہا ہے، کیونکہ ان کی آمد سے وہاں علمی و ادبی نشستیں ہونے لگیں۔ اپنی ذات سے انہوں نے طلبہ ہی نہیں اساتذہ تک کو حتی الامکان فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جس کی مثال یہ ہے کہ وہ پروفیسر آرنلڈ کو عربی پڑھایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے سرسید کے مختلف علمی کاموں میں بھی ہاتھ بٹایا تھا۔

ندوۃ العلماء میں وہ مستقلاً زیادہ مدت تک قیام نہ کرسکے۔ اس زمانے میں قومی مصروفیات انہیں ہردم مصروف عمل رکھا کرتی تھیں لیکن جب جب وہ ندوہ میں قیام کرتے طلبہ ان کی مقناطیسی شخصیت کی وجہ سے ان کے اردگرد جمع ہوکر ان کی شخصیت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ علامہ شبلی خود بھی طلبائے ندوہ کی تعلیم و تربیت میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ لہذا وہ بعض کو خارج وقت میں پڑھاتے تو کبھی جماعتِ طلبہ کو درس دیتے اور کبھی انفرادی طور پر کسی کو پڑھاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ عمومی طور پر طلبائے ندوہ کو مطالعہ اور تصنیف و تالیف کے لئے ابھارا کرتے تھے۔

علامہ نے طلبہ کی تعلیم و تربیت کے لئے بالکل نیا اور اچھوتا انداز اپنایا تھا، وہ طلبہ بلکہ بعض علماء تک کو مطالعہ کتب بینی اور تصنیف و تالیف کی ترغیب دلاتے رہتے تھے۔ طلبہ کو خطوط لکھتے تھے تو نئی نئی کتابوں سے انہیں روشناس کراتے اور مصر و بیروت میں طبع ہونے والی کتب سے انہیں آگاہ فرماتے، ان سے مختلف موضوعات پر مضامین لکھواتے تھے جن کی حک و اصلاح بھی فرماتے، ان کی ہمت و تشجیع سے کبھی غافل نہ رہتے، ایک شفیق استاد کی طرح ان کی

کوتاہیوں پر برہم ضرور ہوجاتے تھے مگر اس برہمی میں بھی بڑا مہر و لطف پنہاں ہوتا تھا اس لئے طلبہ ان سے اس کی وجہ سے بدظن اور بیزار ہونے کے بجائے ان کے اور بھی زیادہ فدائی و شیدائی ہوجاتے تھے۔

علامہ شبلی کے طریقۂ تعلیم و تربیت کا بغور جائزہ لیا جائے تو مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوں گی۔

۱۔ علامہ اپنے خطوط میں احباب، معاصرین بلکہ شاگردوں تک سے بھی علمی معاونت کے طلب گار ہوتے تھے۔ چنانچہ جب انہیں انگریزی کی نئی کتابوں سے معلومات کی ضرورت ہوتی تو کتابیں منگوا کر عزیزوں اور دوستوں سے ان کے ترجمے سنتے، انگریزی داں دوستوں سے فرمائش کرتے کہ فلاں مقام یا مبحث کا خلاصہ لکھ کر بھیجو، کبھی یہ لکھتے کہ اس مضمون کے متعلق نئی معلومات اگر تمہاری نظر سے گزرے تو مطلع کرو، اس کے متعدد شواہد مکاتیب میں موجود ہیں، علامہ کی اس طالب علمانہ ادا میں بھی دراصل ان کا خاص انداز تربیت کارفرما تھا اس سے نہ جانے کتنے لوگوں کو کتب بینی اور مطالعہ کی عادت پڑی ہوگی اور ان کی معلومات میں اضافہ ہوا ہوگا۔

۲۔ وہ خطوط میں علمی معلومات فراہم کرتے تھے، نئی کتب نئے جرائد کے متعلق لوگوں کو آگاہ کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کتابوں پر تبصرے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی غلطیاں درست کرتے، واقعات و حقایق کی وضاحت کرنے اور مآخذ کی نشاندہی فرماتے تھے۔ ضیاء الحسن علوی ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں "فمن الناس" کے متعلق تفسیر کبیر اور کشاف میں کوئی اختلاف قرأت مذکور نہیں، حالانکہ ان دونوں کو اس کا التزام ہے اور "الیاس" کا لفظ کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا، جملہ نہایت لغو ہوجائے گا[۱۷] اس جیسی متعدد مثالیں مکاتیب میں موجود ہیں۔[۱۸]

۳۔ خطوط کے ذریعہ بھی وہ لوگوں کو مطالعہ و تصنیف پر آمادہ کیا کرتے تھے، اس سلسلہ میں ان کی رہنمائی فرماتے تھے اور اس راہ کے پیچ و خم سے آگاہ کرتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو الفاروق پر ریویو لکھنے کے بعد ایک خط میں لکھتے ہیں "ہاں اب ایک بات سُنیے، یہ زورِ قلم مضمونوں اور رسالوں پر ختم نہیں ہونا چاہیے، وسعتِ خیال اب مستقل تصنیف کا میدان چاہتی ہے متوجہ ہوجیے اور کوئی مفید سلسلہ چھیڑ دیجیے۔"[19] ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں "واللہ میرے دل کی بات چھین لی، صحابہ کے حالات سے بڑھ کر کوئی چیز ہمارے لیے نمونہ نہیں بن سکتی لیکن ہر پہلو کو لیجیے اور ان پہلوؤں کو صاف دکھلائیے جن سے آج کل کے مولوی قصداً چشم پوشی کرتے ہیں۔"[20]

۴۔ مولانا کی ایک مستقل عادت یہ تھی کہ طلبہ، معاصرین اور دوسرے اہل تعلق کی برابر ہمت افزائی کیا کرتے تھے، جیسے انہوں نے تناسخ پر عمدہ مضمون لکھنے پر مولانا عبد السلام ندوی کو بہت زیادہ مبارکباد ہی نہ دی بلکہ پانچ روپے انعام بھی دیے اور بہت کم اصلاح کے ساتھ الندوہ میں شایع کر دیا۔[21] علامہ حمید الدین فراہی کو لکھتے ہیں "نظام القرآن کو میں بہت شوق سے دیکھوں گا۔"[22] دوسرے خط میں لکھتے ہیں "تفسیر سورۂ ابی لہب اور جمہرۃ البلاغۃ کے اجزاء بغور دیکھے تفسیر پر تم کو مبارکباد دیتا ہوں۔"[23] علامہ سید سلیمان ندوی اور مولوی عبد الباری بہاری کو ندوہ کے اجلاس میں عمدہ تقاریر کرنے پر اپنی عبا پہنا دی۔[24]

مولانا کی ہمت افزائی کا یہ مثبت طریقہ تھا لیکن وہ کبھی کبھی نفسیاتی طریقے بھی استعمال کرتے تھے۔

علامہ حمید الدین کی تربیت سے متعلق شبلی گرامی کی بعض اہم عبارتیں ملتی ہیں جو ان کے مربیانہ طور و طریق کے علاوہ زیر تربیت طالب علم کی نفسیات کو نمایاں کرتی ہیں مگر اس کے

ساتھ وہ علمی و ادبی افادیت کے پہلو کو بھی پیش کرتی ہیں، بالخصوص امت اسلامیہ کی ضروریات اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے والے مسائل کو اچھی طرح واضح کرتی ہیں۔ وہ علامہ حمید الدین فراہیؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں "خط سے معلوم ہوا کہ عربی عبارت لکھی ہے... اس قسم کے مہملات کام کرو گے، عربی عبارت لکھ کر اپنا دل خوش کرو گے کہ دوسرا حریری پیدا ہوا، اچھا پھر نتیجہ کیا! مسلمانوں کو آج کل حریری اور امرؤ القیس کی ضرورت ہے... اب کلام جدید کا مرحلہ ہے، کوئی انگریزی داں دوست ہوتا تو بڑا کام نکلتا.... تم سے زیادہ کون اس مصرف کا تھا، انگریزی داں تھے، عربی داں تھے، عزیز تھے لیکن ان سب کچھ ہونے کے ساتھ بھی کچھ نہیں، بہتیرا کہا کہ یورپ کے فلسفہ کا ہلکا سا ڈھانچہ بھی کھڑا کر دو تو بہت بصیرت ہو، تم کو کس کی پروا ہے؛[25]

مولانا فراہی کے نام علامہ شبلی کے مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم قرآن، تفسیر، عربی زبان و ادب، تاریخ عرب جاہلی، سیرت نبویؐ، سابقہ کتب مقدسہ وغیرہ مختلف موضوعات کے حوالے سے ان کی تربیت فرمائی تھی۔

۵۔ علامہ زیر تربیت طلباء اور عزیزوں کو جابجا علمی مشورہ دیتے ہیں، ان کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں، ان کے مضمون/تصنیف کا دائرہ کار متعین کرتے ہیں، مضمون کے خاص خاص مقامات وغیرہ کو زیادہ نمایاں کرنے کی نصیحت کرتے تھے، جیسے علامہ حمید الدین فراہیؒ کو نظام القرآن کے متعلق لکھتے ہیں "ایک اور امر یہ ہے کہ تم صرف رابطہ کی چیزوں کو لیتے ہو حالانکہ اعتراض یہ ہے کہ دو مربوط مطلب کے بیچ میں جو غیر متعلق باتیں آجاتی ہیں، وہ سلسلۂ کلام کو برہم اور غیر منظم کر دیتے ہیں، ان کا تعلق اور ربط ثابت کرنا چاہیے۔"[26] نظام القرآن کے متعلق ہی لکھتے ہیں "نام بدل دو یعنی الف گھٹا دو، نظام میں ذرا بھدا پن ہے۔"[27] اسی کے

متعلق ایک اور خط میں لکھتے ہیں "بلاغت کے بعض اجزا معمولی اور سرسری ہیں، ارسطو کا رد البتہ قابل قدر ہے... عبارت میں جابجا کمزوریاں ہیں، تعجب یہ ہے کہ تم اذا اور لما کے محل استعمال میں فرق نہیں کرتے"[18] سید صاحب کو لکھتے ہیں "دونوں پرچوں میں تمہارا مضمون بہت اچھا نکلا، اب تم کو تصنیفی سلیقہ آچلا ہے، البتہ عبارت کی ابھی تک کمزوری باقی ہے وہ بھی جاتی رہے گی"[19] سید ابوظفر دسنوی ندوی کو لکھتے ہیں، "ابن خلدون اور ابن خلکان میں ابن خلکان زیادہ معتبر ہے گو ابن خلدون فلاسفر ہے"[20] مولانا عبدالسلام ندوی کو لکھتے ہیں "... تم خود اگر قرآن مجید پر کوئی کتاب لکھتے تو کن عنوانوں کو لیتے، انہیں کو شروع کرو پھر میں بتاتا بھی جاؤں گا"[21] مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں "... نکاح وراثت تعزیرات، تعدد ازدواج کی تاریخ اور ان کے جدید اصولوں کے متعلق لکھنے کی بھی ضرورت ہے"[22] سید نظر الحسن چودھری کو لکھتے ہیں "جناب امیر (یعنی حضرت علی مرتضیٰؓ) کی عمدہ سوانح عمری کی سخت ضرورت ہے، نہایت ناتمام کتابیں اب تک لکھی گئیں، عربی میں کوئی جامع تصنیف نہیں، ان کے غزوات اور محاربات کے علاوہ ان کے علمی کارنامے بہت ہیں، اگر آپ عربی سے خوب واقف ہیں تو میں بہت مدد دے سکتا ہوں"[23]

اس طرح کی متعدد مثالیں حیات شبلی اور مکاتیب شبلی میں بکھری ہوئی ہیں، ہم نے محض چند پر اکتفا کیا۔

۶۔ علامہ اپنی تمام تر شہرت وحیثیت کے باوجود اپنے خوردوں سے نہ صرف علمی مشورے کرتے تھے بلکہ ان پر عمل بھی کرتے تھے، ان سے علمی کام لیتے تھے، ان کی آرا کا خاص خیال رکھتے تھے، یہ علامہ کی تربیت کا سب سے اہم اور بنیادی نقطہ ہے، کیونکہ جب کوئی بڑا شخص اپنے کسی چھوٹے سے مشورہ کرتا ہے، اس سے علمی تعاون چاہتا ہے تو جہاں اس کا لامحالہ یہ اثر و نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ خود اس کے متعلق خوب چھان پھٹک کر معلومات حاصل کرے گا جس سے

اس طالب علم کی ہمت افزائی بھی ہوتی ہے کہ میرے استاد نے مجھے اس کام کے قابل سمجھا جو اس کی لگن اور آتش شوق کو مزید مواد دے دیتی ہے۔ سید صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں "کعب بن اشرف یہودی اور ابو رافع کا قتل باذن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بخاری میں منقول ہے اس کو کیوں کر اخلاق کے موافق تسلیم کیا جائے"[24] مولانا حمید الدین فراہی کو لکھتے ہیں "تم نے ایک زمانہ میں مجھ سے کہا تھا کہ تم نے مثنوی مولوی روم غور سے پڑھی اور ان کے اصول اور پرنسپلز متعین کئے، اگر خیال میں ہو تو لکھ بھیجو"[25] ایک خط میں لکھتے ہیں "انجیل اور توریت میں خاص اخلاقی احکام کہاں مل سکتے ہیں یعنی کون سے باب اور فصل ہیں"[26] مزید لکھتے ہیں "آیت تخییر (ازدواج) اعتزال، مظاہرۂ ازدواج تین واقعے الگ الگ بیان کئے جاتے ہیں، لیکن میرے نزدیک سب ایک ہی سلسلہ کے اور ہم زمان ہیں، ابن حجر کی بھی یہی رائے ہے۔ تم اپنی تحقیق لکھو"[27] مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں "اسلام کے وقت روم، فارس، ہند کی تمدنی اور اخلاقی حالت کیا تھی اس کو تلاش کرکے لکھئے"[28]

یہ چند مثالیں ہیں ورنہ خطوط میں اس کی خصوصاً سیرت نبوی کے لئے علمی معاونت کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کس طرح خوردوں سے کام لے کر ان کی غیر شعوری طور پر تربیت فرمایا کرتے تھے، علامہ کی اس صلاحیت اور خوردوں کے مشوروں پر عمل کے نتیجہ میں مضامین عالمگیر اور سیرۃ النبی جیسے عظیم الشان کام منصۂ شہود پر آئے[29]

۷۔ علامہ کے طریقہ تربیت کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ وہ اپنے خیالات کو اپنے شاگردوں پر زبردستی نہیں مسلط کرتے تھے۔ ان کے علمی اختلاف کو غور سے سنتے اور ان کی اہم چیزوں کو قبول بھی کرلیتے تھے اور اس علمی اختلاف پر ان کی ہمت افزائی کرتے تھے اور ان کو مزید علمی تحقیق پر ابھارتے تھے۔ کہ وہ ان کے اختلاف کی بنا پر ان سے ناراض ہوکر قطع تعلق نہیں کرتے تھے، بلکہ شدید اختلاف کے

باوجود وہ اپنے شاگردوں کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے اور اپنے برتاؤ میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ علامہ کی یہی خصوصیت تھی جس نے طلبہ کو ان سے باندھ رکھا تھا، چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے الکلام پر بڑی سخت تنقید لکھی مگر علامہ نے معلوم ہوجانے کے باوجود ان سے کچھ نہ کہا اور ان کے ساتھ حسن سلوک، محبت و شفقت کا وہی سلوک کرتے رہے جس طرح وہ پہلے کرتے رہے تھے جس کا اعتراف مولانا عبدالماجد دریابادی نے خود ہی کیا ہے"..... ادھر مولانا کی بزرگانہ شفقت تھی کہ لکھنے والے کا نام جان لینے کے بعد بھی نہ مٹی، نہ گئی"[۳۹]

علامہ شبلی کی تعلیم و تربیت کی اس خصوصیت نے نہ جانے کتنے ذروں کو آفتاب و ماہتاب بنایا ہوگا اور انہیں علمی دنیا میں بلند درجہ و مرتبہ سے ہم کنار کیا ہوگا۔ اگر ان کے اس طرز عمل کی پیروی کی جائے تو اس شکوہ کی ضرورت نہیں رہ جائے گی کہ "یہ قحط الرجال کا زمانہ ہے، اچھے اور قابل افراد موجود نہیں ہیں بلکہ اس طرز عمل کی وجہ سے ایک جماعت دوسری جماعت کی جگہ لیتی رہے گی اور علمی خلا اگر مکمل طور پر نہ سہی تو کافی حد تک ضرور پورا ہوتا رہے گا، کیونکہ علامہ کے قول میں تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ "ایک لائق استاد ہزاروں آدمیوں کے دلوں پر حکمرانی کرتا ہے"۔[۴۰]

حواشی

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے حیات شبلی از سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڈھ ص ۱۸۰ اور ۳۰۰-۳۰۸ [۲] ایضاً ص ۸۲، [۳] ایضاً ص ۸۲، [۴] ایضاً ص ۱۸ [۵] ایضاً ص ۱۵۲ [۶] عبدالماجد دریابادی: شبلی۔ انسان، مصنف اور مصنف گر، معارف اعظم گڈھ مارچ ۱۹۶۵ء ص ۱۹۴ [۷] ایضاً ص ۲۰۱ [۸] حیات شبلی ص ۱۵۲ [۹] معارف ۱۹۶۵ء ص ۲۰۰ [۱۰] حیات شبلی ص ۶۹۱ [۱۱] ایضاً ص ۶۹۲ [۱۲] دیکھئے مکاتیب شبلی دارالمصنفین اعظم گڈھ حصہ اول طبع چہارم ۱۹۶۶ء ص ۲۴۸ خط نمبر ۱۸۱ بنام امین

زبیری، خط نمبر ۳۹ بنام مولانا آزاد ص ۲۰۸ [۱۳] تفصیل کے لئے دیکھئے حیات شبلی ص ۶۹۷-۶۹۸ [۱۴] علامہ شبلی نے اپنی معتمدی کے زمانہ میں ندوہ میں تکمیل کا درجہ کھولا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو کسی فن میں ماہر و کامل بنایا جائے جو اتفاق سے پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا، لیکن بعد میں ان کے خیالات کو عملی جامہ پہنایا گیا جس کا خاطر خواہ فائدہ سامنے آیا، سید صاحب نے اسے ان کی زمانہ معتمدی کا سب سے اہم کارنامہ قرار دیا ہے۔ اس درجہ کی مختلف شاخوں کے لئے علامہ نے جو نصاب متعین کیا تھا اور اس میں داخلہ پانے والے اولین طلبا کے نام اور اس کے اثرات حیات شبلی میں مذکور ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے ص ۴۲۷-۴۳۱ [۱۵] ایضاً ص ۶۹۸-۶۹۹ [۱۶] دفعہ نمبر ۶ کے علاوہ سارے قواعد خود ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں اور دفعہ نمبر ۶ بھی انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھی تھی، تفصیل کے لئے دیکھئے حیات شبلی ص ۶۹۹ [۱۷] مکاتیب شبلی حصہ ۲ ص ۱۴۸ [۱۸] مکاتیب شبلی حصہ ۲ ص ۶-۷، ۱۱-۱۲-۲۰، اور متعدد مقامات [۱۹] ایضاً ۱/ص ۱۱۵ [۲۰] ایضاً ۱/ص ۱۱۹ [۲۱] حیات شبلی ص ۴۴۵ و ۴۲۴ [۲۲] مکاتیب شبلی ۲/ص ۱۳ [۲۳] ایضاً ۲/ص ۲۰ [۲۴] حیات شبلی ص ۴۵۸ و ۴۲۵ [۲۵] مکاتیب شبلی حصہ دوم ص ۱۰۱ خط نمبر ۱۶ [۲۶] ایضاً ۲/ص ۱۴۱ خط نمبر ۱۹ [۲۷] ایضاً ۲/ص ۲۰ خط نمبر ۲۸ [۲۸] ایضاً ۲/ص ۳، خط نمبر ۲ [۲۹] ایضاً ۲/ص ۱۶۳ خط نمبر ۲ [۳۰] ایضاً ۲/ص ۱۵۰-۱۵۱ خط نمبر ۴ [۳۱] ایضاً ۱/ص ۳۰۰ خط نمبر ۱۶ [۳۲] ایضاً ۱/ص ۳۲۸ خط نمبر ۲ [۳۳] ایضاً ۲/ص ۱۰۴ خط نمبر ۳ [۳۴] ایضاً ۲/ص ۱۸ خط نمبر ۲۵ [۳۵] ایضاً ۲/ص ۱۳ خط نمبر ۴ [۳۶] ایضاً ۲/ص ۴۵ خط نمبر ۶۶ [۳۷] ایضاً ۱/ص ۲۹۶ خط نمبر ۹ [۳۸] حیات شبلی ص ۴۵۴ [۳۹] معارف مارچ ۱۹۶۵ء ص ۱۸۹ [۴۰] علامہ کا اصل قول یہ ہے "ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دل پر حکمرانی کرتا ہے"۔ (مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۲۴۸ خط نمبر ۱۸۱ بنام امین زبیری۔)

ہندوستان کے مسلم حکمراں
اور
ملک کی سرحدوں کی حفاظت

از جناب انیس احمد چشتی صاحب٭

قرآن کریم میں کسی بادشاہ یا حکمراں کے لئے دو شرائط لازمی قرار دی گئی ہیں: ۱۔علم ۲۔جسم

قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ	پیغمبر (حضرت اشموئیلؑ) نے کہا، بے شک
وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ	اللہ نے پسند فرمایا اس کو تم پر اور زیادہ
(البقرہ: ۲-۲۴۷)	فراخی دی اس کو علم اور جسم میں۔

حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل کی بے راہ روی کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر جالوت جیسے ظالم حکمراں کو مسلط کر دیا تھا۔ انہوں نے اس سے تنگ آکر پیغمبر سے عرض کی کوئی بادشاہ ہم پر مقرر کر دو کہ اس کے ساتھ مل کر ہم جہاد کریں۔ پیغمبر نے اللہ کے حکم سے طالوت کو ان پر مقرر کیا جس کی قوم میں کبھی بادشاہت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے دولت اور ثقافت کے بل پر کہا کہ کیا ہم میں سے کوئی اس قابل نہ تھا۔ اس پر حضرت اشموئیلؑ نے فرمایا کہ سلطنت کسی کا حق نہیں۔ اس کے لئے اصل اور بڑی لیاقت عقل اور بدن میں زیادتی اور وسعت ہے اور اس لحاظ سے طالوت تم سے افضل ہے۔

٭۹۴-۱مر گنج پیٹھ - پونے۔

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی حکمرانی ہمیشہ ان ہی لوگوں کے حصے میں آئی ہے جو عقل کے ساتھ زبردست جسمانی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ یعنی تدبر کے ساتھ وہ تلوار کے بھی دھنی تھے۔ گزشتہ زمانے میں حکمرانوں کے لئے فن سپہ گری سے واقفیت لازمی تھی۔ سکندر اگر شجاعت و دلیری میں مرد تھا تو پورس بھی حرب شناسی میں فرد تھا۔ اشوک نے گو بعد میں جنگوں سے توبہ کر لی تھی لیکن جتنے علاقے پر اسے تصرف حاصل رہا وہ اس کی شمشیر کا ہی کرشمہ تھا۔

اسلام جس کی انسانیت نوازی اور رحم پروری ضرب المثل ہے۔ اس نے بھی خلافت سے لے کر صوبوں کی گورنری تک کے لئے جن لوگوں کا بھی انتخاب کیا۔ ان میں اس کی نگاہ میں فہم و فراست کے بعد جو عنصر سب سے لازمی تھا وہ ان کی جسمانی وجاہت اور میدانِ جنگ میں شرکت بلکہ اس میں تکرار و توارد کو افضلیت تھی۔ فاتح ایران حضرت سعد بن وقاصؓ کا جسم حالانکہ آبلہ زدہ تھا جو میدان جنگ میں ایک ضرب کاری کا نتیجہ تھا، لیکن ایران کے ہر معرکے میں وہ بنفس نفیس شریک رہے اور فتح ایران کا سب سے زبردست اور پُرشعور معرکہ قادسیہ میں برپا ہوا جس کی کمان میدان جنگ میں ایک نسبتاً بلند جگہ پر بیٹھ کر انجام دی لیکن اس عارضے کے باوجود جنگ میں شریک مجاہدین نے ان کو معاف نہیں کیا، کیونکہ وہ تکلیف کی وجہ سے میدان جنگ میں اتر نہیں سکتے تھے اور شہادت کی صورت میں خطرات میں اضافہ ہو سکتا تھا، اس لئے جنگ میں فتح پانے کے بعد انہوں نے تمام افواج کو اکٹھا کیا اور اپنے زخم دکھائے۔ تب کہیں جا کر معاملہ رفع دفع ہوا۔

حضرت عمرو بن العاصؓ مصر کے گورنر تھے لیکن انہیں یہ گورنری امیر المومنینؓ کی محض خیر اندیشی اور خوشنودی کے صلے میں عطا نہیں ہوئی تھی بلکہ مصر کی سرزمین میں انہوں نے دیگر مجاہدین کے ساتھ کاری زخم اٹھائے تھے۔ بقول اقبال:

مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی ! (دریوزہ خلافت) خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے

محمد بن قاسم کو سندھ بلکہ ہند کا پہلا فاتح تسلیم کیا جاتا ہے لیکن سندھ پر اس کا حملہ محض کشور کشائی اور ملک گیری کے لئے نہ تھا بلکہ اس وقت کی اسلامی خلافت ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے بالکل آمادہ نہ تھی۔ کیونکہ خود مسلمانوں کی سلطنت اتنی وسیع ہو چکی تھی اور داخلی مسائل اتنے زیادہ تھے کہ وہ مزید کسی حکومت کو اپنے قبضے میں لے کر اپنے مسائل میں اضافے کے خواہاں نہیں تھے لیکن جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے سراندیپ کے راجہ نے اس وقت کی واحد اور سب سے بڑی اسلامی سلطنت سے تعلق پیدا کرنے اور حجاج بن یوسف ثقفی کی عنایات کو اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے آٹھ جہازوں کا ایک بحری بیڑہ تیار کیا اور ان میں نہایت قیمتی تحائف بار کئے تاکہ وہ اسلامی حکومت کے دارالخلافے پہنچ کر خیر سگالی کا ذریعہ بنیں۔ ان جہازوں میں تحائف کے علاوہ سفارتی عملہ، وہ سوداگر جو فریضۂ حج ادا کرنے کے خواہاں تھے اور وہ بیوہ عورتیں اور یتیم بچے بھی سوار تھے جن کے سرپرست عرب سوداگر ان ساحلی علاقوں میں فوت ہو گئے تھے۔ یہ یتیم اور بیوائیں اپنے وطن یعنی ملک عرب پہنچنے کے خواہش مند تھے تاکہ اپنے رشتہ داروں کے پاس رہ کر اپنی بقیہ زندگی گزار سکیں۔ لیکن یہ جہاز جب بحر عمان میں داخل ہوئے تو مخالف ہواؤں کی زد میں آگئے اور بے قابو ہو کر کسی طرح دوبارہ ساحل ہند کی شمالی بندرگاہ دیبل پہنچ گئے۔ یہ علاقہ اس وقت راجہ داہر کے قبضے میں تھا۔ یہاں کے گورنر اور سپہ سالار نے عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا اور جہاز کے تحائف کو لوٹ کر انہیں اپنے بحری بیڑے میں داخل کر لیا۔ جب حجاج کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو اس نے سفارتی سطح پر اپنے افراد اور جہاز کو چھڑانے کی ساری کوششیں کر ڈالیں لیکن سندھ کے حکمراں راجہ داہر نے نہایت مغرورانہ اور غیر مناسب رویہ اختیار کیا۔ جس کے نتیجے میں حجاج بن یوسف کو مجبوراً محمد بن

قاسم کی سرکردگی میں فوج کشی کرنی پڑی۔ جس کے مقابلے کے لئے راجہ داہر خود میدان جنگ میں اتر آیا لیکن اسے شکست ہوئی اور گرفتار ہو کے قتل ہوا۔

یہاں ایک بہت اہم بات ذہن میں رکھنے کی یہ ہے کہ عرب اسلامی حکومتوں کے تقریباً ۵۰۰ مسلمان باغی سپاہی محمد بن قاسم کی فوج کشی سے آٹھ سال پہلے سندھ میں آکر آباد ہو چکے تھے اور ان سب کے سرغنہ محمد بن حرث علافی نے اپنی بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھا کر راجہ داہر کی سلطنت میں بڑا اثر ورسوخ حاصل کر لیا تھا یہاں تک کہ وہ راجہ داہر کا وزیر بن بیٹھا تھا اور سکوں کے ایک طرف راجہ داہر کا اور دوسری طرف محمد بن حرث بن علافی کا نام کندہ ہوتا تھا اور جب راجہ داہر کے ملک پر محمد بن قاسم نے حملہ کیا تو اسی لشکر علافی نے اسلامی لشکر کا نہایت بہادری سے مقابلہ کیا تھا۔ اس واقعہ سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر وجاہت اور جسامت کے محمد بن حرث علافی ایک ہندو راجہ کے دربار میں اتنا جلیل القدر عہدہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ وہاں اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے خود مسلمانوں کے مقابلے میں مسلمان صدیوں پہلے سے تن کر کھڑے ہوتے چلے آئے ہیں۔

سیاست کو شجاعت سے الگ کر دینے کا رواج اب ہوا ہے۔ جس میں یورپ کی چالاکی اور ساز باز کو بڑا دخل ہے۔ امریکہ میں آج بھی اسکولوں اور کالجوں میں چاہے کم مقدار میں ہی کیوں نہ سہی فوجی تربیت ضروری قرار دی گئی ہے۔ خود جارج واشنگٹن (۱۷۳۲ء تا ۱۷۹۹ء) نے امریکہ کو ٹیرنٹن (TERENTON) اور پرنسٹن (PRINCETON) کے معرکوں میں بحیثیت فوجی جرنیل لڑ کر انگلستان سے آزادی دلائی تھی۔ لارڈ کارنوالس کے مقابلے میں نوآبادیاتی فوجوں کی کمان کرتے ہوئے جب اس نے سارا ٹوگا کے میدان میں فتح حاصل کی ہے تو اسّی کلومیٹر تک گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا، نیویارک پہنچ کر جس چرچ میں اس نے سجدۂ شکر ادا کیا تھا وہ چرچ

دو سو سال گزرنے کے بعد بھی تاریخ کا حصہ بنا ہوا ہے۔ اسی مرد میداں کی صدارت میں ۱۷۸۷ء میں مجلس دستور ساز CONSTITUTIONAL CONVENTION کا انعقاد ہوا اور اتفاق رائے سے اسے صدر مملکت منتخب کر لیا گیا لیکن اسی کو جب تیسری مرتبہ صدارت کی پیش کش کی گئی تو اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لوگوں نے اس کی میدانی اور غیر معمولی قومی خدمات کے اعتراف میں اسے "بابائے قوم" (THE FAIHER OF HIS COUNTRY) کا خطاب عطا کیا۔ جارج واشنگٹن اور ٹیپو سلطان کا سنہ وفات ایک ہی ہے۔

خود یورپ میں بھی کسی مملکت کا بادشاہ سپاہیانہ صلاحیت ہی کی بنا پر تخت نشین ہوتا تھا۔ حالانکہ اقتدار اعلی چرچ (ویٹی کن سٹی) کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور تمام بادشاہ پوپ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہوتے تھے۔ تاہم بادشاہوں کی اپنی بھی طاقت ہوتی تھی اس کی وجہ سے چرچ اور بادشاہوں کے درمیان متعدد مقامات پر بڑے بڑے معرکے ہوئے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ بادشاہوں نے بھی اور پاپائے روم نے بھی مسلمانوں اور بطور خاص ترکی کے مشہور زمانہ امیر البحر (ADMIRAL) خیر الدین باربروسہ (متوفی: ۹۵۳ھ / ۱۵۴۶ء) سے فوجی مدد طلب کی تو اس نے مذہب کو دنیا پر فوقیت دی اور پاپائے روم کا ساتھ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شاہی افواج (ROYAL ARMY) کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں حملوں کے نتیجے میں انگلستان میں بادشاہ مخالف سرگرمیوں کو پنپنے کا موقع ملا اور آلیور کراموپل (OLIVERCROMWELL) (۱۵۹۹ء تا ۱۶۵۸ء) جیسا طاقت ور شخص ابھرا اور انگلستان کے بادشاہ کے خلاف مقدمہ کر کے چارلس اول کو ۱۶۵۳ء میں وہائٹ ہال کے چوراہے پر لایا اور اس کا سر لکڑی کے کندے پر رکھ کر کلہاڑے سے قلم کرا دیا اور یورپ کے بادشاہوں کو کہلا بھیجا کہ "ہم جواب میں تمہیں اپنے بادشاہ کا سر بھیجتے ہیں"۔ یہی

آلیور کراموپل مسلسل چھ برسوں تک انگلستان کا بے تاج بادشاہ بنا رہا۔ ظاہر ہے یہ طاقت اسے میدان جنگ سے ہی حاصل ہوئی تھی۔ اس نے عوام پر مشتمل ایک فوج (CAVALRY REGIMENT) ترتیب دی تھی جسے لوگ فولاد رُخ (IRONSIDES) کہتے تھے۔ اسی فوج نے آلیور کراموپل کی کمان میں شاہی افواج (ROYAL ARMY) کے مقابلے میں ہر معرکہ سر کیا اور اپنے کمانڈر کو عظیم محافظ (LORD PROTECTOR OF THE REALM) کے منفرد عہدے تک پہنچا دیا تھا۔

یورپ اور دوسرے تمام ملکوں میں عرصے تک سپہ گروں کو ہی راج گدی پر بیٹھانے کا دستور قائم رہا۔ آج بھی متعدد اسلامی اور غیر اسلامی ریاستوں کے سربراہ اور امیر مملکت فوجی افراد ہی ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی تسلط کے بالکل شباب کے دنوں میں دیسی والیان ریاست جو انگریزوں کے دست نگر اور ان کے شہزادے انگلستان کے تعلیم یافتہ تھے۔ اپنے آپ کو فوجی افسر ثابت کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس کی بہت اچھی مثال فرمانروائے بھوپال کرنل ایئر کموڈور، ہز ہائی نس نواب سکندر صولت افتخار الملک محمد حمید اللہ خاں بہادر، جی سی ایس آئی، جی سی آئی ای، سی وی او، بی اے، ایل ایل ڈی چانسلر چیمبر آف پرنسز کی ہے۔ جو ایک نواب ہوتے ہوئے بھی سپہ گری کے تمغات کو ذریعہ عزت گردانتے تھے۔

برا ہو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کا جس نے دنیا کے مطلع پر فوجی افراد ہی میں سے ایسے لوگوں کو چمکا دیا جو پہلے تو سیاسی رہنما بنے پھر فوجی آمر اور اس کے فوراً بعد انہوں نے اپنی طاقت کا فاشسٹ (فسطائی) حکمرانی کے لئے استعمال کیا۔ ہماری مراد ہٹلر اور مسولینی سے ہے جو بالترتیب جرمنی اور اٹلی کے حکمراں تھے۔ انہیں دو فاشسٹ طاقتوں کو ختم کرنے

کے لئے اقتدار اعلیٰ پر مسلط یورپ کے بعض ممالک، انگلستان اور امریکہ کے غیر فوجی افراد نے رات دن ایک کر دئے اور ان طاقتوں کو ختم کر کے دم لیا۔ اس کے بعد فوجی حکمرانوں کو بنظر استحسان نہیں دیکھا جاتا اور سیاسی یونین بازوں نے فوجی مہارت رکھنے والے افراد کو قانونی شکنجے میں کس کر اپنا زیرنگیں بنا رکھا ہے۔ انہیں اس بات کا ڈر ہے کہ اگر مسلح طاقتوں کے یہ جن بوتلوں سے آزاد ہوگئے تو پھر نہ ہماری ہی خیر رہے گی اور نہ جمہوریت کی۔ اقبال نے ایسے ہی حکمرانوں کو "معصومان یورپ" کہا ہے۔

اس سے بحث نہیں کہ ارباب اقتدار کا یہ فیصلہ کتنا صحیح اور کتنا غلط ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ سرحدوں پر فوجی خون بہاتے ہیں اور اعزاز وہ سیاسی لیڈر حاصل کرتے ہیں جنھوں نے کبھی دیوالی میں آتش بازی بھی سر نہیں کی ہوتی ہے، توپ وتفنگ تو دور کی بات ہے۔ سرحد پر جا کر جان دینے کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جن ملکوں سے فوجیں برسرپیکار ہوتی ہیں انہیں ملکوں سے سیاستدانوں کے بچے اور ان کی پارٹی کے کارکن دوسرے دروازے سے تجارت کر رہے ہوتے ہیں۔

ہندوستان ایک زمانے سے دنیا کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا ہے۔ شاید ہی کوئی قوم ایسی رہی ہو جس نے اس کو للچائی ہوئی نظر سے نہ دیکھا ہو۔ ہن، کشان، یونان سے سکندر، یورپ سے انگریز، فرانسیسی (FRENCH) ولندیزی، پرتگالی وغیرہ خراسانیوں، ترکوں، افغانیوں اور عربوں نے بھی اس کو اپنی تاخت کا نشانہ بنایا۔ لیکن دوسری قوموں اور مسلمانوں کی تاخت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ دوسری قومیں ہندوستان کی وفادار نہیں رہیں۔ جب کہ مسلمان اس ملک کے وفادار تھے، انہوں نے نہ یہاں کی دولت کو لوٹنے کے لئے حملہ کیا تھا اور نہ اپنے ملکوں کو مالامال کرنے کے لئے۔ یورپ اور امریکہ کی موجودہ چمک دمک میں اس ملک کی صدیوں سے

لوٹی گئی دولت اور یہاں کے غریب باشندوں کا خون پسینہ بھی شامل ہے۔ لیکن مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہ ہندوستان آئے۔ یہاں کے (RESOURCES) کو انہوں نے استعمال کیا اور یہیں رہ بس گئے۔ اس کو اپنی محنت وجانفشانی سے گل وگلزار بنا دیا۔ انہوں نے یہاں رشتہ داریاں قائم کیں۔ وہ یہاں کے لوگوں کے بھائی بند بن گئے اور یہاں کی دولت یہیں کی ترقی کے لئے استعمال کی۔ لیکن سر دست اس سے تعرض کئے بغیر ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

اوپر گزر چکا ہے کہ ہندوستان پر ایک نامعلوم زمانے سے اتر اور پچھم کی جانب رہنے والی قوموں کے لگاتار حملے ہوتے رہے تھے۔ جب مسلمانوں نے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا تو وسط ایشیا سے سالا زار اور طاقتور قبائل اٹھے جنھوں نے اپنا رخ ہندوستان کی طرف موڑ لیا۔ یہ لوگ پہلے حملہ آوروں کے مقابلے میں بہت زیادہ طاقتور تھے۔ لیکن سلطان محمود غزنوی کی اولاد نے راستے کی دیوار بن کر اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔ مگر ان وحشیوں کو ہندوستان کی طرف قدم بڑھانے نہ دیا اور ان کا رخ ایران، عراق اور ترکستان کی طرف موڑ دیا اور ان اسلامی ملکوں کو ان سے زبردست نقصان پہنچا۔

ساڑھے سات سو سال پہلے شمالی ہند میں غلاموں کے خاندان کی حکومت کے زمانے میں تیسرا سیلاب چین کے پہاڑوں سے اٹھا۔ یہ سیلاب چنگیزی تاتاریوں کا تھا جن کا مذہب بودھ اور چین کے مقامی عقائد سے ملتا جلتا تھا اور جن کا کام ہی تمام مورخین کے متفقہ بیان کے مطابق خوں ریزی اور نسل انسانی کی بربادی تھا۔ اس وحشی اور درندہ صفت قوم کے متعلق یورپ میں مشہور تھا کہ ہر بات پر یقین کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ کبھی نہیں مانا جا سکتا کہ منگولوں کو شکست ہو سکتی ہے۔ چنگیز خاں کی فوجوں کا یہ دستور تھا کہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر روزانہ

سینکڑوں میل چلتے۔ کسی ایک بستی پر لاکھوں کی تعداد میں حملہ کرتے۔ جب وہاں سے گزرجاتے توپیچھے لاشوں کے ڈھیر اور دھواں اور آگ چھوڑجاتے۔ اس فوجی افسر کو سب سے بڑا RANK ملتا جس کا کھوپڑیوں کا آرائشی مینار سب سے اونچا ہوتا۔ جنگل بیابان سے گزرتے وقت رسد کی کمی پڑجاتی تو انسانوں کے تازہ گوشت سے اپنا پیٹ بھرتے۔ ستارۂ ہند راجہ شیو پرشاد نے اپنی تاریخ میں لکھاہے کہ جلال الدین خوارزمی ہندوستان پر حملے کے خواب دیکھ رہا تھا اور وہ ایک بار اٹک کی ندی پار کر کے سندھ تک آبھی گیا تھا لیکن جب اسے پتہ چلا کہ منگول اس کا پیچھا کر رہے ہیں تو وہ کسی طرح سے بچ بچا کر نکل گیا۔ منگولوں کے ہاتھ اور تو کچھ نہ آیا لیکن اپنے ظلم کا نشان وہ یہ چھوڑ گئے کہ دس ہزار ہندوؤں کو غلام بنانے کے واسطے پکڑ کر لے گئے:

"اور جب ان کے لشکر میں رسد کی قلت ہوئی تو بے تکلف ان سب غلاموں کے سر کاٹ ڈالے"۔

سر ڈی میکنزی والس اپنی کتاب "روس کی تاریخ" میں لکھتا ہے کہ:

"اول روسیوں کو معلوم نہ تھا کہ یہ طاقتور دشمن کون ہے؟ کہاں سے یہ لوگ آئے ہیں اور کیا مذہب رکھتے ہیں، نہ صرف روس میں انہوں نے غلبہ پایا بلکہ ان کی وجہ سے مغربی یورپ اور انگلستان میں خوف سے زلزلہ پیدا ہوگیا۔ یہ گروہ جو پورے ایشیا میں پھیلا ہوا تھا اب یورپ کے بیچ تک پہنچ گیا تھا"

منگولوں نے متعدد ملکوں پر حملے کئے اور ہندوستان پر بھی کئی مرتبہ چڑھائی کی، لیکن سوائے دو جگہوں کے انہیں کہیں شکست نہیں ہوئی۔ ایک تو ہندوستان میں اور دوسرے مصر میں اور دونوں جگہ مسلمانوں نے ہی انہیں زیر کیا۔

ہندوستان پر منگولوں کا پہلا حملہ سلطان شمس الدین التمش کے زمانہ میں ہوا اور آخری مرتبہ انہوں نے علاء الدین خلجی کے زمانے میں چڑھائی کی۔ ان کا سب سے سخت حملہ غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں ہوا۔ بلبن نے ان پر قابو پانے کے لئے طاقت کے ساتھ ساتھ عقل کا بھی استعمال کیا۔

یہ منگول اس ملک میں اسی معروف راستے سے داخل ہوئے تھے جس راستے سے آج در انداز آتے ہیں۔ چونکہ غیاث الدین بلبن ان کی زبردست فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس نے یہ تدبیر کی کہ اپنے فوجی دستے ان پہاڑیوں پر متعین کر دئے جن کے نیچے سے گزرنے والے دروں سے منگولی فوج ہندوستان میں داخل ہو رہی تھی اور حکم یہ تھا کہ جب دشمن کی فوج گزر جائے تو پیچھے والے سپاہی چھپے راستوں سے آگے آکر کھڑے ہو جائیں چنانچہ سیکڑوں میل تک بلبن کی چھوٹی سی فوج یہی کرتی رہی۔ دشمن نے جب یہ دیکھا کہ اس کی فوج تو ختم ہونے ہی کو نہیں آتی تو ان کی ہمت ٹوٹ گئی۔ کچھ نے ہتھیار ڈال دئے۔ کچھ بھاگ گئے۔ بہت تھوڑے لوگ پہاڑی دروں کو پار کر پائے اور میدان میں گھر کر لڑے۔

بلبن نے دوسرا انتظام یہ کیا کہ اس نے اپنے بہادر بیٹے شہید خان اور چچازاد بھائی شیر خان کو سرحدوں کی حفاظت کے لئے مامور کر دیا۔ دونوں شہزادے منگولوں سے بار بار ٹکر لیتے رہے یہاں تک کہ سرحد کی حفاظت کرتے کرتے شہید ہو گئے۔

ہندوستان پر غلام بادشاہوں کا یہ زبردست احسان ہے کہ انہوں نے منگولوں کو پنجاب اور ملتان کی جانب سے بھی اور بنگال اور آسام کی طرف سے بھی آنے سے روکا اور ان وحشیوں کی زد سے ہندوستانیوں کو بچا لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منگولوں نے ایران، عراق شام اور آذربائیجان کے اسلامی ملکوں کو برباد کر کے بغداد میں عباسی خلافت کا چراغ بجھا

نگل کر دیا اور لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں مسلمانوں کو خاک و خون میں ملا کر روس اور یورپ تک کی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ اگر مسلمان بادشاہ اپنی جان کی بازی لگا کر ہندوستان کی سرحدوں کی حفاظت نہ کرتے بلکہ درباروں اور محلوں میں رنگ رلیاں مناتے رہتے تو آج یہاں مندر، مسجد، چرچ اور بودھوں اور جینیوں کے دھرم شالے نہ بچتے۔ مشہور مورخ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی لکھتے ہیں:

"جس زمانے میں منگولوں کی قتل و غارت گری کے سبب، ساری دنیا میں خون کے فواروں کے ساتھ آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے، اس زمانے میں بھارت میں غلام بادشاہوں کی ہندو پرجا امن اور شانتی کے ساتھ آنند کے ستار بجا رہی تھی اور سلطان غیاث الدین بلبن کا چچازاد بھائی شیر خان اور بیٹا شہید خان بھارت کی مغربی سرحدوں پر منگولوں کے حملوں کو روکنے اور بار بار ان کو شکست دے دے کر بھگا دینے میں مصروف تھے۔ اس طوفانی زمانے میں غلاموں نے جس طرح بھارت میں امن وامان رکھا اس زمانے کی دنیا میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہی وجہ تھی کہ چالیس[۴۰] کے لگ بھگ تباہ حال فرمانرواؤں نے ایشیا کے مختلف ملکوں سے فرار ہو کر بھارت میں پناہ لی تھی۔"

منگولوں نے ہندوستان پر آخری حملہ ۱۳۱۵ء میں علاء الدین خلجی کے زمانے میں کیا، ایک منگولی شہزادہ دو لاکھ کی زبردست فوج لے کر راستے کی ساری رکاوٹوں کو دور کرتا ہوا سیدھا دہلی پر چڑھ آیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پہلے راجدھانی پر قبضہ کر لیا جائے پھر دوسروں سے نپٹا جائے۔ دو لاکھ منگولوں کا اچانک دہلی کی دیوار کے نیچے آجانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ شہر میں کہرام مچا ہوا تھا اور ہر چیز کی تنگی پیدا ہو گئی تھی۔ آس پاس کے لوگ بھی بھاگ بھاگ کر

دہلی میں آگئے اور گلی کوچوں میں آدمی ہی آدمی نظر آنے لگے، اس وقت علاء الدین خلجی نے جس سمجھ داری سے کام لیا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس نے چھانٹ چھانٹ کر سوا لاکھ لڑنے والے اکٹھے کیے اور میدان میں نکل کر منگولوں کی فوج پر دھاوا بول دیا۔ بھارت کی مستند تاریخ میں اس وقت تک اتنی بڑی دو فوجوں کا ایک میدان میں مقابلہ نہ ہوا تھا۔ علاء الدین خلجی کا سب سے بہادر سپہ سالار ظفر خاں نہایت بہادری سے لڑتا ہوا میدان میں شہید ہوا۔ منگول فوج گھبرا گئی اور جس تیزی سے آئی تھی اسی تیزی سے چلی گئی۔

انگریزوں نے اپنے طویل دور حکومت میں جو سیاہ اور بدتر کام انجام دئے ان میں سب سے سنگین کام یہ تھا کہ انہوں نے یہاں کے باشندوں کے دلوں میں مسلمان بادشاہوں کے خلاف برے خیالات جاگزیں کر دئے اور نفرت کی آگ بھڑکا دی جو کور کسر رہ گئی تھی آزادی کے بعد فرقہ وارانہ نفرت و اشتعال پھیلانے والے ملک دشمن اور انسانیت بیزار مورخین اور مصنفین نے پوری کر دی۔ ان کی فتنہ سامانیاں آج بھی جاری ہیں بلکہ پچھلے ۱۵-۲۰ برسوں میں اس میں مزید شدت پیدا ہوئی ہے۔ ملک میں ہندو مسلم نفرت پھیلانے کا سب سے آسان نسخہ یہ ایجاد کیا گیا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کو جی کھول کر برا بھلا کہا جائے اور انہیں ہندو کش اور مندر توڑنے والا ثابت کیا جائے۔ سب سے زیادہ نشانے پر اورنگزیب اور محمود غزنوی رہتے ہیں۔

محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ[۱۷] حملے کئے، اس کے چوطرفہ حملے میں اس کی فوجیں مدھیہ پردیش، راجستھان، گجرات، پنجاب، سندھ، کشمیر، بلوچستان، پشاور، صوبہ سرحد، اتر پردیش اور بہار تک پہنچ گئی تھیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس نے یہاں اپنی کوئی مستقل حکومت قائم نہیں کی، وہ برابر غزنی کا ہی حکمراں رہا اور وہیں اس نے زندگی کی آخری سانسیں لیں۔ اس کے دور کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہو سکتی ہے کہ وہ کیوں اس ملک پر بار بار

حملہ آور ہوتا رہا۔ ہمارے خیال میں اس کی چار وجہیں تھیں۔

۱۔ غزنی پر آئے دن چڑھائی کرنے والے ہندوستانی راجاؤں کی سرکوبی کے لئے۔

۲۔ مسلمانوں کے بھیس میں اسلام دشمن قرامطہ سے ہندوستانی راجاؤں کی سرپرستی ختم کرنے کے لئے۔

۳۔ ہندوستانی ریاستوں میں مقیم غزنی کے باغیوں سے نپٹنے کے لئے۔

۴۔ کشورکشائی کے ذریعے پورے علاقے میں اپنی دھاک بٹھانے کے لئے۔

یہاں نہ اس بحث میں پڑنے کی گنجائش ہے اور نہ یہ ہمارا موضوع ہے، تاہم یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ سلطان محمود کی ارادی یا غیر ارادی فوج کشی کی وجہ سے ہندوستان کو ایک بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ کوہ ہمالہ جو مغرب سے مشرق تک ایک زبردست قدرتی دیوار کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ اس میں راستے بن گئے۔ نئے نئے راستے دریافت ہوئے۔ پگڈنڈیوں کو جوڑ کر پہاڑوں میں شاہراہیں تعمیر ہوگئیں۔ نئے نئے آبشار، برفانی وادیاں، جھرنے اور برفانی سلسلے دریافت ہوئے اور حیرت انگیز طور پر یہی راستے آج تک معروف ہیں اور ہماری آمد و رفت کے لئے ایک بڑا سہارا بنے ہوئے ہیں۔ اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ جنگیں جہاں انسانیت کے لئے مصیبتیں لاتی ہیں وہاں وہ آنے والی نسلوں کے لئے نئے نئے راستے کھول دیتی ہیں۔

محمود غزنوی ایک لاکھ فوج کے ساتھ ۴۰۹ھ مطابق ۱۰۱۸ء میں کشمیر پر حملہ آور ہوا۔ یہ اس پر اس کا دوسرا حملہ تھا۔ پہلے حملہ کو ادھورا چھوڑ کر اسے اپنے ملک کے اندرونی خلفشار کی وجہ سے ۴۰۶ھ (۱۰۱۵ء) میں واپس جانا پڑا تھا۔ اس مرتبہ جب بغیر جنگ کے کشمیر کے راجہ نے اطاعت و فرمانبرداری قبول کر لی تو محمود غزنوی نے اسے اپنا راز دار بنا لیا اور اپنی فوج کے ہراول دستے کا سپہ سالار اعظم قرار دے کر اس سے کہا کہ ہمیں قنوج اور مہابن (متھرا)

اور برن وغیرہ پر حملہ آور ہو کر وہاں کی سازشوں کا قلع قمع کرنا ہے۔ تم ہم کو کسی طرح پہاڑوں ہی پہاڑوں پر سفر کرا کر اس طرح لے چلو کہ ان راجاؤں کو کانوں کان خبر نہ ہو سکے۔ چنانچہ کشمیر کے راجہ نے رہبری کا فریضہ انجام دیا اور اس نے سلطان اور اس کے لشکر کو پنجاب کے دریاؤں سے اٹھا کر گنگا اور جمنا کے دہانوں سے گزار کر کوہ ہمالہ کے اندر ہی اندر سفر کراتا ہوا رام گنگا کے دہانے تک پہنچا دیا۔ سلطان محمود کے اس پہاڑی سفر کا حال ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی کے حوالے سے روسی میجر جنرل ایل این سیولوف "ہندوستان پر حملے" نامی کتاب میں لکھتا ہے:

"محمود کمر کشمیر پر حملہ آور ہوا۔ پھر قنوج پر چڑھائی کا ارادہ کیا۔ جو اس زمانے میں ہندوستان کا دارالسلطنت تھا۔ ۱۰۱۸ء کے موسم بہار میں محمود ایک لاکھ سوار اور تیس ہزار پیدل سپاہ کے ہمراہ کشمیر و پشاور کے راستے ہندوستان آیا۔۔۔۔ فوج مذکور کو انتہا درجے کی کٹھن گھاٹیوں برف پوش ہیبت ناک دروں اور خطرناک کوہی آبشاروں اور ندی نالوں کو عبور کرنا پڑا۔۔۔۔ یہ ساری مصیبتیں اس لئے جھیلی گئی تھیں کہ اس کی یورش کا راز مخفی رہے۔ محمود اپنی فوج کو کشمیر سے لیہہ لے گیا۔ جو سطح سمندر سے ۱۱،۰۳۰ فٹ بلندی پر واقع ہے۔ پھر لداخ اور وہاں سے بتدریج شوشول و ہردوہ کے دروں میں پہنچا جو ۱۳،۳۶ فٹ سطح سمندر سے بلند ہیں بعدہٗ سلسلہ ہمالیہ کو ڈینگور جو ۱۸،۱۳۰ فٹ بلند ہے (یا ٹنگور جو ۱۶،۰۰۰ فٹ بلند ہے) کے قریب سے طے کیا۔۔۔۔ لیکن جب غزنی کا لشکر نیپال کی مغربی سرحد پر پہنچ گیا تو انہیں معلوم ہوا کہ خوفناک سپہ سالار طاقتور لشکر کے ساتھ ہندوستان کے قلب میں معرکہ آرا ہونے کے لئے بگولے اور آندھی کی طرح تیزی سے چلا آتا ہے۔ لیکن تیاریوں کے لئے اب وقت کہاں؟ محمود اپنے شاندار رسالے کے ساتھ قنوج پر جو وادیٔ گنگا میں واقع ہے صاعقہ

کی طرح جا پڑا ....."

مولانا اکبر شاہ کے بیان کے مطابق قنوج کے راجہ کنور رائے نے اس اچانک حملے سے اپنی سلطنت بچانے کا یہ آسان طریقہ اختیار کیا:

"قنوج کا راجہ کنور رائے محمود کی صفت خطا بخشی سے واقف تھا.... لہذا اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے گلے میں دوپٹہ ڈال کر اور اپنے ہاتھ رومال سے بندھوا کر مع اپنے بیٹوں اور قریبی رشتہ داروں کے محمود کے سامنے آکھڑا ہوا۔ محمود نے یہ دیکھ کر فوراً اس کے ہاتھ کھولے، گلے سے لگایا اور اپنے برابر تخت پر بٹھایا اور ہر طرح تسلی و تشفی دے کر رخصت کیا۔ وہ اب اس کا مہمان عزیز بن کر قنوج میں داخل ہوا اور تین روز یا آٹھ روز تک راجہ کا مہمان رہا۔"

لالہ بابو رام اجودھیا پرشاد نے بھی اپنی کتاب "مختصر سیر گلشن ہند" میں یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ فوج کو پورا ہمالیہ پار کرنے میں تین ماہ لگ گئے، انہوں نے پورا ہمالیہ چھان ڈالا اور فوجی راہبری (SAPPERS) کا وہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا کہ آج تک لداخ اور لیہہ سے لے کر سکم اور بھوٹان تک ایسے پہاڑی راستے وجود میں آگئے ہیں جن پر ہماری دفاعی افواج گزر کر سرحدوں کی حفاظت کرسکتی ہیں۔

اکبر کے زمانے میں ایک انگریز سیاح اس کے دارالسلطنت فتح پور سیکری کی سیر کے لئے آیا جب دن بھر کی سیر کے بعد وہ شام کو دربار پہنچا تو بادشاہ نے اس سے اپنے نئے تعمیر شدہ شہر کے بارے میں دریافت کیا، انگریز نے شہر کے حسن، موزونیت اور دلکشی وغیرہ کی بے حد تعریف کی مگر اس کمی کی شکایت کی کہ دشمنوں سے حفاظت کے لئے اس میں فصیل تعمیر نہیں کی گئی ہے۔

اکبر نے اس کا جو جواب دیا وہ تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رہے گا:

"اگر ہم اپنے دشمنوں کو کابل اور قندھار کی سرحد پر نہیں روک سکے تو فتح پور سیکری کی دیواروں پر کیسے روک سکیں گے۔"

احمد شاہ ابدالی کے ذریعہ پانی پت میں مراٹھا طاقت کے زوال کے بعد جب شاہ عالم دہلی کے تخت پر متمکن ہوا تو اس وقت حیرت انگیز طور پر ہمارے اس عظیم الشان ملک ہندوستان کی صرف سرحدوں پر ہی نہیں بلکہ محلوں اور درباروں تک پر انگریزوں کا قبضہ ہوچکا تھا۔ اب یہاں پر صرف سرحدوں کا ہی مسئلہ نہ تھا بلکہ انگریزوں کو سرحدوں سے باہر کرنا بھی ضروری تھا۔

مغل تاجدار اکبر اعظم کے جانشین جہانگیر کا نام آتے ہی ذہن میں انارکلی کا تصور ابھرنے لگتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ سلیم کو سوائے رقص و سرود کی محفلوں کے آراستہ کرنے اور انارکلی سے عشق فرمانے کے کوئی دوسرا کام ہی نہ تھا۔ تقریباً یہی تصور بادشاہ شاہ عالم اور دیگر سلاطین مغلیہ کے معاملے میں بھی ابھرتا ہے۔ لیکن حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگزیب کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے تینوں بیٹوں اعظم، معظم اور کام بخش میں ٹھن گئی اور ہر ایک تخت کا دعویدار ہوا۔ تاہم اعظم اور کام بخش مغلوب ہوئے اور معظم ۱۷۰۷ء میں بہادر شاہ کے خطاب سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۶۵ سال کی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے بندہ نامی ایک باغی سکھ سردار کی سرکوبی کی کیونکہ اس نے پنجاب کے علاقے میں لوگوں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ عورتوں کی عصمت دری، مسجدوں میں آگ لگا دینا، مذہبی لوگوں کو زندہ آگ میں جھونک دینا اس کے مظالم کی معمولی مثالیں ہیں۔ چنانچہ بہادر شاہ نے ان ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچایا یہاں تک کہ وہ شدید جنگ سے گھبرا کر پہاڑوں میں روپوش ہونے پر مجبور ہوگئے۔ یہ جن بہادر شاہ کا ذکر ہوا ہے وہ غالب کے ہم عصر اور آخری مغلیہ تاجدار نہ تھے۔

اورنگزیب کے بعد جتنے بھی بادشاہ اس پورے ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں سریر آرائے سلطنت ہوئے ان سے زیادہ سخت زمانے اور برے وقت کا سامنا مغل سلطان کو نہیں کرنا پڑا تھا۔ سادات کی کارستانیاں، درباری پریشانیاں اور اندرونی خلفشار کے علاوہ ان کے لئے سب سے بڑی آزمائش ہندوستان کی سرزمین پر انگریزوں کا وجود تھا۔ پھر ان کے علاوہ پلاسی کی لڑائی، احمد شاہ ابدالی کا پہلا حملہ، مراٹھوں کی یورش، وزراء کی بغاوت اور خود مختاری کا اعلان، نادر شاہ کا حملہ اور قتل عام، جنگ پانی پت، سکھوں کی یلغار، میر جعفر کی فتنہ سامانیاں، ایسٹ انڈیا کمپنی کا روز افزوں بڑھتا دجل و فریب، مرکز کے کمزور ہوجانے کی وجہ سے ملک میں بڑھتی ہوئی طوائف الملوکی اور عقائد کے آپسی جھگڑے غرض ان سارے مسائل کو اگر ضرب تقسیم کرکے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بابر سے لے کر اورنگزیب تک کسی مغل شہنشاہ نے اتنی مختصر مدت میں مصیبت کے اتنے بھیانک دن کبھی نہ دیکھے ہوں گے، جتنے کہ اورنگزیب کے بعد آل تیمور کو دیکھنے پڑے۔

محمد شاہ کے بعد دولت مغلیہ کی شمع بجھنے تک دہلی کے لال قلعے نے ۵ بادشاہوں کا منھ دیکھا۔ احمد شاہ (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) عالمگیر ثانی (۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۹ء) شاہ عالم ثانی (۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء) اکبر ثانی (۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء) اور بہادر شاہ ثانی ظفر (۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۷ء) اس طرح سے یہ ۵ بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ عالم نے ۴۷ سال، اکبر شاہ ثانی نے ۳۱ سال اور بہادر شاہ ظفر نے پورے بیس سال حکومت کی۔ عالمگیر ثانی کے عہد میں ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کی لڑائی لڑی گئی۔ جس میں رابرٹ کلائیو کے ہاتھوں سراج الدولہ کو زبردست شکست ہوئی اور وہ اپنے نمک حرام وزیر اور قائد افواج کی غداری کی وجہ سے گرفتار ہوا اور نہایت بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ اس جنگ میں اودھ کے نوابین اور دہلی کے شہنشاہ کی نفری اور مالی طاقت بھی شریک تھی۔ شاہ عالم کے ۴۷ سالہ

دور حکومت میں ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی ہوئی اور یہی وہ زمانہ ہے جب جنوب میں سلطان ٹیپو شہیدؒ نے ۱۷۹۹ء میں انگریزوں سے آخری اور فیصلہ کن جنگ لڑی اور داد شجاعت دے کر میدان جنگ میں جام شہادت نوش کیا۔ اسی عہد میں حضرت سید احمد شہیدؒ نے اکبر شاہ ثانی کے عہد میں سفر حج کا دوبارہ اجراء کیا اور انگریزوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے ایک باقاعدہ فوج ترتیب دی اور ہندوستان کی شمالی مغربی سرحدوں پر پہنچ کر انگریزوں کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا اور بالاکوٹ (موجودہ پاکستان) میں جام شہادت نوش فرمایا۔ ان کے ساتھ بے شمار مجاہدینؒ نے بھی شہادت پائی جن کے سرخیل حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پوتے اور شاہ عبد الغنی کے صاحبزادے حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ تھے۔ انہوں نے ۱۸۳۱ء میں شہادت پائی۔ مسلمانوں کو اس پر فخر ہونا چاہئے کہ اتنی قیمتی جانوں کا نذرانہ انہوں نے اس سرزمین پر آج سے تقریباً پونے دو سو سال پہلے اسی علاقے کے قریب پیش کیا جہاں سیاسی بازیگروں کی غفلت سے حال ہی میں در انداز گھس آئے تھے۔

ٹیپو سلطان ہندوستان کا واحد حکمراں ہے جو میدان جنگ میں انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہوا اور جس کا خاص مقصد انگریزوں کو اس ملک سے نکالنا تھا، نہ کہ اپنی سلطنت بچانا، اس کے لئے اس نے جو راستہ اختیار کیا تھا۔ اس میں شکست کی صورت میں موت یقینی تھی۔ تقریباً یہی طریقہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے ہزاروں مریدین اور رفقاء نے بھی اختیار کیا تھا۔ یہاں سید صاحب کے حالات اور خدمات کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں تاہم ان کی حب الوطنی اور سیکولر انداز کو سمجھنے کے لئے ان کے ایک فارسی مکتوب کا ترجمہ نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو تقریباً ۱۸۲۰ء میں افغانستان کی سرحد سے ریاست گوالیار کے مدار المہام اور مہاراجہ دولت رائے سندھیا کے وزیر اعظم اور برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کو

لکھا گیا تھا:

"جناب کو خوب معلوم ہے کہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے دنیا جہاں کے تاجدار اور سودا بیچنے والے تاجر، سلطنت کے مالک بن گئے ہیں، بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بڑے بڑے اہلِ حکومت کی حکومت اور عزت کو انہوں نے خاک میں ملا دیا ہے جو حکومت و سیاست کے مردِ میدان تھے، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اس لیے مجبوراً چند غریب و بے سر و سامان کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے اور محض اللہ کے دین کی خدمت کے لئے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ یہ اللہ کے بندے دنیا دار اور جاہ طلب نہیں ہیں۔ محض اللہ کے دین کی خدمت کے لئے اٹھے ہیں، مال و دولت کی ان کو ذرہ برابر طمع نہیں ہے جس وقت ملک غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششوں کا تیر اپنے نشانے تک پہنچ جائے گا، حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن کو ان کی طلب ہوگی۔ ہم کمزوروں والیان ریاست اور بڑے بڑے سرداروں سے صرف اسی بات کی خواہش ہے کہ جان و دل سے اسلام کی خدمت کریں اور مسندِ حکومت کو برقرار رکھیں۔" (سیرت سید احمد شہیدؒ: ص ۱۲۵ و ۱۲۶)

کتابیات

۱۔ قرآنِ حکیم: ترجمہ از شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ ۲۔ تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اول و سوم، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۳۔ کلیاتِ اقبال (اردو) ڈاکٹر سر محمد اقبال ۴۔ آوازِ دوست، مختار مسعود ۵۔ THE READERS ENCYCLOPAEDIA: ولیم روز بینیٹ WILLIAM ROSE ۶۔ الفاروق، مولانا شبلی نعمانی ۷۔ آئینۂ حقیقت نما، مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی ۸۔ ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

سید صباح الدین عبدالرحمن ۹۔ عرب و ہند کے تعلقات، مولانا محمد اکرمی ندوی بھٹکلی ۱۰۔ مسلمانوں کا عروج و زوال، مولانا سعید احمد ایم اے ۱۱۔ اسوۂ صحابہ، مولانا عبدالسلام ندوی ۱۲۔ فردوسِ آسیہ، شیخ محمد عبدالرب صاحب قادری ۱۳۔ زبدۃ البخاری، ترجمہ از: مولانا آغا رفیق صاحب بلند شہری؛ جون ۱۹۳۰ء ۱۴۔ دربار اکبری، مولانا محمد حسین آزاد ۱۵۔ سیرت سید احمد شہیدؒ (جلد اول) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۱۶۔ نوائے آزادی، مرتبہ: عبدالرزاق قریشی۔ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۱۷۔ DR.B.N.PANDE : TIPU : A DEMOCRAT ۱۸۔ AN OUTLINE OF AMERICAN HISTORY: یو ایس انفارمیشن سینٹر ۱۹۵۲ء ۱۹۔ شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا، سید قاسم محمود ۲۰۔ MUHIUDDIN AHMED : SAYED AHMED SHAHEED

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کا ایک سہو

از

جناب پروفیسر اکبر رحمانی *

علامہ اقبال کی صحبتوں سے مستفید و فیض یاب ہونے والوں اور ان کے سفر و حضر میں شریک رہنے والوں میں ایک اردو فارسی کے ممتاز عالم، محقق، مورخ، ادیب اور اقبال شناس ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائیؒ بھی تھے۔ اقبالیات کے موضوع پر ان کی دو کتابیں (۱) روایاتِ اقبال اور (۲) اقبال کی صحبت میں، حوالے کی کتابوں کا درجہ رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے اپنی کتاب 'اقبال کی صحبت میں' علامہ کے کئی دوستوں، عقیدت مندوں اور معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ ان میں علامہ اقبال کے مداح، عقیدت مند اور شاگرد محمد عباس علی خاں لمعہ حیدرآبادی بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے لمعہ حیدرآبادی کے بارے میں درج ذیل معلومات بیان کی ہیں:

"اقبال نامہ حصہ اول (۲۶۴ - ۲۹۸) میں ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کے نام علامہ اقبال کے انتیس ۲۹ خطوط ملتے ہیں۔ پہلا خط اپریل ۱۹۲۹ء کا لکھا ہوا ہے اور آخری جس میں علامہ کی طرف سے معذرت کی گئی ہے اور جو محمد شفیع (م۔ش) کے قلم سے ہے ۳۱ اگست ۱۹۳۷ء کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس زمانے (۱۹۲۹ء) سے بھی بہت پہلے یہ شخص علامہ کے ساتھ خط و کتابت کرتا رہا ہے اور میرے نقطۂ نظر سے سابقہ خطوط میسر نہیں آئے۔ مجھے بھی علامہ کی

* مدیر اعلیٰ ماہنامہ آموزگار، جلگاؤں، مہاراشٹر۔

خدمت میں حاضر رہنے کا شرف حاصل تھا اور میں جانتا ہوں کہ علامہ کے ساتھ عباس علی لمعہ کا رابطہ اس زمانے سے بہت پہلے قائم ہو چکا تھا۔ مجھے علامہ کے ہاں سے لمعہ کی نظموں کا ایک مجموعہ ملا تھا جس پر ۲۲ جنوری ۱۹۲۳ء کی تاریخ درج ہے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۳ء سے بھی پہلے ان صاحب نے علامہ کے ساتھ مراسلت و مکاتبت شروع کر دی ہو گی نظموں کا یہ مجموعہ راقم نے اقبال اکیڈمی کے حوالے کر دیا تھا جو اب بھی وہاں موجود ہے اس میں لمعہ نے علامہ کی خدمت میں منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جو اس کے سچے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ ان اشعار کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علامہ کا عاشق تھا اور ان کی مدح و ثنا کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ چنانچہ خطوط سے پہلے جو رباعی درج ہے وہ بھی لمعہ کے مخلصانہ جذبات کی آئینہ دار ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

تو ہے شاہ جہانِ بے نیازی ہے عالم گیر تیری نے نوازی

ہیں نازاں تجھ پہ عطار و سنائی مرید پیر رومی، مرد نمازی"

لمعہ نے حضرت علامہ کی خدمت میں بعض دوسری کتابوں کے علاوہ قرآن مجید کا ایک نسخہ بھی ارسال کیا تھا، جس کے متعلق علامہ نے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کا مطالعہ کروں گا۔ یکم دسمبر ۱۹۳۴ء کے ایک خط میں علامہ نے اپنی صحت کے بارے میں لمعہ کو اس طرح مطلع کیا:

"حکیم نابینا صاحب دہلی والے علاج کر رہے ہیں۔ فرق ضرور ہے مگر عام طور پہ گفتگو کرنے میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ جناب کی گراں قدر رائے کا شکریہ"

علامہ نے بھوپال سے بھی ایک خط لمعہ کو لکھا تھا جس میں تحریر فرمایا کہ "آپ کی تازہ نظم پڑھ کر میں بہت خوش ہوا۔ اس میں اصلاح کی گنجائش نہیں ہے"۔ اس کے علاوہ مولانا روم کو بغور پڑھنے کا مشورہ دیا اور یہ شعر تحریر فرمائے:

نگہدار آنچہ در آب و گلِ تست — سرور و سوز و مستی حاصل تست

تہی دیدم سبوے ایں و آں را — مے باقی بہ مینائے دلِ تست

۱۱ مئی ۱۹۳۵ء کے خط میں علامہ نے لکھا:

"آپ کے ایما پر ٹیگور میری مزاج پرسی کے لئے لاہور آئے تھے مگر میں لاہور میں موجود نہ تھا۔ اس لئے ملاقات نہیں ہوسکی۔ آپ انہیں مطلع کر دیں"۔

پھر، جولائی ۱۹۳۵ء کے خط میں علامہ نے تحریر فرمایا کہ "ٹیگور آپ سے بے حد خوش ہیں"۔ ایک خط علامہ نے ڈاکٹر لمعہ کے والد کی مزاج پرسی کے سلسلے میں تحریر فرمایا ہے۔ ایک میں لمعہ کی چند نظمیں پہنچنے کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علامہ کی مدح میں مسلسل نظمیں لکھتے رہتے تھے اور ان کے کلام کے گرویدہ تھے"۔ [1]

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ممتاز پاکستانی محقق اور ماہر اقبالیات ہیں۔ وہ مشہور مصور عبدالرحمن چغتائی کے بھائی تھے۔ ۱۹۳۸ء میں پیرس یونیورسٹی سے فرانسیسی زبان میں تاج محل پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی تھی۔ دکن کالج پونا جہاں ممتاز عالم و محقق علامہ سید سلیمان ندوی کچھ عرصہ ملازم تھے وہاں ڈاکٹر چغتائی نے بہ حیثیت ریڈر کام کیا تھا اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا اغیار سے منوایا تھا۔ علامہ اقبال بھی ان کی علمی صلاحیت کے قدر داں تھے۔ مصوری، خطاطی، آثار قدیمہ، اسلامی تاریخ و تہذیب اور اقبالیات پر انہوں نے ،، کتابیں تصنیف کیں۔ ظاہر ہے اتنا بڑا عالم اور محقق جو کچھ بیان کرے گا وہ بلا تحقیق نہ ہوگا، پھر یہ کہ وہ علامہ اقبال کی صحبت میں رہتے تھے، اس لئے بھی ان کے بیان کو درجۂ استناد حاصل رہے گا شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہ ہوگی۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے علامہ اقبال سے لمعہ حیدرآبادی کی مراسلت کے آغاز کے بارے میں

جو انکشاف فرمایا وہ یقیناً چونکا دینے والا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے میں بھی چکرا گیا۔ میرے پاس سوانح لمعہ حیدرآبادی کا جو قلمی نسخہ ہے اس میں سوانح نگار عبدالعزیز خاں نے لمعہ کی تاریخ پیدائش ۱۹۱۱ء بمقام جعفرآباد (ضلع جالنہ مراٹھواڑہ) بتائی ہے [2] اگر ڈاکٹر چغتائی کے محولہ بالا بیان (۱۹۲۳ء سے بھی پہلے لمعہ نے علامہ کے ساتھ مراسلت و مکاتبت شروع کر دی تھی) کو تسلیم کر لیں تو ہمیں اس بات پر یقین کرنا ہوگا کہ نو دس برس کی عمر سے ہی لمعہ نے علامہ سے خط و کتابت شروع کر دی تھی، ظاہر ہے اسے کوئی صاحب ہوش و حواس شخص تسلیم نہیں کرے گا۔

یہاں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ڈاکٹر چغتائی نے یہ قیاس آرائی ٹھوس شہادت اور معتبر حوالے کی بنیاد پر کی ہے۔ انہیں علامہ کے ہاں سے لمعہ کی نظموں کا جو مجموعہ ملا تھا اس پر ۲۲ جنوری ۱۹۲۳ء کی تاریخ تحریر تھی۔ اس بنیاد پر کوئی بھی محقق یہ قیاس آرائی کر سکتا ہے کہ ۱۹۲۳ء سے بھی پہلے ان صاحب (لمعہ) نے علامہ کے ساتھ مراسلت و مکاتبت شروع کر دی ہوگی۔

جب میں نے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی جیسے اعلیٰ پائے کے محقق کا مذکورہ بیان پڑھا تو شدید الجھن میں مبتلا ہوگیا۔ دل میں گمان پیدا ہوا کہ کہیں دو لمعہ نہ ہوں؛ اس گمان کو تقویت اس وقت پہنچی، جب میں نے لمعہ حیدرآبادی کے پسماندگان اور لواحقین سے ملاقات کرنے کے لئے حیدرآباد دکن کا سفر کیا۔ پتہ چلا کہ عثمانیہ یونیورسٹی سے کوئی طالبہ لمعہ حیدرآبادی کے موضوع پر ایم فل کے لئے تحقیقی مقالہ لکھ رہی ہے اور اس کے نگراں ماہنامہ سب رس حیدرآباد کے اڈیٹر ڈاکٹر مغنی تبسم ہیں۔ ڈاکٹر موصوف اردو کے ممتاز ادیب، نقاد اور محقق ہیں۔ ڈاکٹر زور مرحوم کے قائم کردہ 'ادارہ ادبیات اردو' میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے اس طالبہ کا تحقیقی کام دکھایا ان کاغذات کے مطالعہ سے پہلی بار پتہ چلا کہ حیدرآباد میں دو شاعروں کا تخلص لمعہ تھا۔ ان دو شاعروں کے بارے میں سید شکیل احمد لکھتے ہیں:

"اقبال نامہ کے مرتب کے بموجب ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ کو حیدرآبادی تسلیم کرلیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حیدرآباد میں دو شعراء کا تخلص لمعہ تھا اور دوسرے لمعہ جو پہلے لمعہ کے سینئر تھے ان کا نام سید نوازش علی موسوی تھا۔ تزک محبوبیہ، جلد دوم دفتر ہفتم میں ص ۱۴۹ پر انہی لمعہ حیدرآبادی کا تذکرہ ہے جو میر کاظم علی خاں شعلہ کے فرزند اور امیر الشعراء نواب میر احمد علی خاں شہید کے پوتے تھے۔ یہ حیدرآباد میں رجب ۱۲۸۶ھ کو پیدا ہوئے اور منصب دار موروثی کے علاوہ کوتوالی بلدہ حیدرآباد دکن میں مددگار محاسبی کی خدمت بجارہے تھے۔ محلہ دار الشفاء قریب جام باغ میں ان کا گھر تھا۔ اگر علامہ اقبال کے دوسرے سفر حیدرآباد کے وقت وہ حیات میں تھے تو لامحالہ وظیفہ حسن خدمت پر زندگی بسر کررہے ہوں گے۔ واضح رہے کہ تزک محبوبیہ، ۱۳۲۱ھ م ۱۹۰۳ء میں شایع ہوئی تھی"۔

سید شکیل احمد مزید لکھتے ہیں:

"جناب سید نوازش علی موسوی لمعہ حیدرآبادی کی علامہ اقبال سے خط وکتابت یا مراسم کا کوئی تذکرہ تاحال موجود نہیں ہے۔ شاید مستقبل کا کوئی محقق اس پہلو پر کوئی روشنی ڈال سکے"۔[۱۲]

اس طرح یہ مسئلہ تو حل ہوگیا تھا کہ علامہ اقبال سے جس لمعہ حیدرآبادی کی مراسلت تھی وہ محمد عباس علی خاں تھے، سید نوازش علی موسوی نہیں تھے۔ اب صرف یہ الجھن باقی رہ گئی تھی کہ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کو علامہ اقبال کے ہاں سے نظموں کا جو مجموعہ ملا تھا اور جسے انہوں نے اقبال اکیڈمی پاکستان کے حوالے کردیا تھا، وہ کون سے لمعہ کا تھا؟ اس مجموعہ پر جو تاریخ درج تھی وہ واقعی ۲۲ جنوری ۱۹۲۳ء تھی یا کوئی اور تاریخ تھی؟ یہ الجھن اس وقت دور ہوئی جب میں پاکستان گیا۔

مئی ۱۹۸۹ء میں راقم نے پاکستان کا سفر کیا۔ کراچی خواجہ حمید الدین شاہد، مشفق خواجہ حکیم محمد سعید، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور علامہ کے بھتیجے اعجاز احمد سے ملاقات کے بعد ۳۰ مئی ۱۹۸۹ء کو کراچی سے لاہور کے لئے روانہ ہوا۔ جناب مشفق خواجہ نے بذریعہ فون 'بزم اقبال لاہور' کے چیرمین ڈاکٹر وحید قریشی کو میری روانگی سے مطلع کردیا تھا۔ راقم پہلے ہی اپنے کرم فرماؤں میرزا ادیب، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور پروفیسر سید محمد سلیم اور سید اسد گیلانی کو لاہور روانگی کی تاریخ سے مطلع کرچکا تھا۔ چنانچہ لاہور پہنچنے پر ان تمام اصحاب نے دلی خیر مقدم کیا اور لمعہ اور اقبال پر تحقیقی کام میں ہر ممکن تعاون دیا۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مجھے سب سے پہلے اقبال اکاڈمی پاکستان کے دفتر واقع مسلم ٹاؤن لے گئے۔ وہاں اکاڈمی کے نائب ناظم ڈاکٹر وحید اشرف سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب سے غائبانہ طور پر متعارف تھا، خط وکتابت تھی اور کتابوں کا لین دین بھی تھا۔ جب بھی کسی پاکستانی کتاب کی ضرورت محسوس ہوتی ڈاکٹر صاحب کو خط لکھ دیتا اور وہ کتاب بھیج کر تعاون فرماتے۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اقبال اکاڈمی کی مطبوعات تحفتاً عنایت کی۔ جب میں نے اپنی آمد کی غرض و غایت بتائی تو ڈاکٹر وحید عشرت نے فوراً "قلمی نوادرات کے ذخیرے میں سے لمعہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظموں کا قلمی نسخہ منگواکر دیا اور بعد میں اس کی زیراکس کاپی بھی فراہم کی۔

یہ قلمی مخطوطہ اقبال اکاڈمی پاکستان لائبریری کی فہرست میں "اقبال (منظوم قلمی نسخہ در مدح اقبال) از عباس علی خاں" کے عنوان سے درج ہے۔ رجسٹریشن نمبر ۳۱۲۴ ہے۔ "$3\frac{1}{2}$ × $6\frac{1}{2}$" سائز کی ۳۲ صفحات پر مشتمل بیاض پر اقبال اکاڈمی پاکستان کراچی اور لاہور دونوں کے دائرہ نما اسٹامپ لگے ہوئے ہیں۔ اس بیاض میں تمام نظمیں لمعہ حیدرآبادی کے ہاتھ کی تحریر کردہ ہیں۔ خط خوبصورت اور پختہ ہے۔ ہر نظم کا انتساب انگریزی میں 'اقبال' کے نام لکھا ہوا ہے۔ انتساب کی عبارت اس طرح ہے:

WITH PROFOUND REGARDS FROM

M. ABBAS ALI KHAN

TO

DR. SIR MOHAMMAD IQBAL M.A. PH.D. BAR AT LAW.

ہر نظم کے آخر میں لمعہ کے دستخط مع تاریخ درج ہے۔ تمام نظمیں ماہ جنوری ۱۹۳۳ء کی مختلف تاریخوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ پہلی نظم پر ۱ جنوری ۱۹۳۳ء کی تاریخ تو آخری نظم پر ۲۳ جنوری ۱۹۳۳ء کی تاریخ درج ہے۔ بعض نظموں پر سن صاف تحریر ہے لیکن بعض پر ۳۳ء اس طرح لکھا ہے کہ وہ ۲۳ء معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ ڈاکٹر چغتائی نے ۳۳ء کو ۲۳ء پڑھ لیا۔ اس ادنی غلطی نے کتنی الجھنیں پیدا کر دی تھیں۔ بہرحال جس لمعہ کے اقبال سے تعلقات تھے وہ محمد عباس علی خاں تھے، انہی کی نظموں کا مجموعہ ڈاکٹر چغتائی نے اقبال اکاڈمی کے حوالے کیا تھا اور ان نظموں پر ۱۹۳۳ء کی تاریخ درج تھی۔ اس لئے یہ قیاس آرائی کہ لمعہ حیدرآبادی کی علامہ اقبال سے خط و کتابت ۱۹۲۳ء سے پہلے سے تھی قطعی بے بنیاد ہے۔

گزشتہ چند برسوں سے اقبال نامہ میں لمعہ حیدرآبادی کے نام اقبال کے خطوط کو وضعی اور جعلی ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کی بنیاد بھی اسی طرح کی معمولی غلطیاں ہیں۔ ایسے لوگوں کے سامنے جب ڈاکٹر عبداللہ چغتائی جیسے مستند محقق اور علامہ کے ہم نشیں کا محولہ بالا غلط بیان سامنے آتا ہے وہ تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر اس کو پرکھنے اور بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل کرکے حقیقت کا پتہ چلانے کے بجائے نہایت آسانی سے حتمی فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ لمعہ حیدرآبادی جعل و فریب کا نام ہے اور اس کے نام اقبال کے خطوط سراسر جعلی اور وضعی ہیں۔

حواشی

لہ اقبال کی صحبت میں۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی۔ اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور۔ ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۹۴ تا ۳۹۶ ؁ قلمی سوانح لمعہ حیدرآبادی۔ عبدالعزیز خاں۔ مملوکہ اکبر رحمانی۔ ص ۵ ؁ اقبال اور حیدرآباد۔ سید شکیل احمد۔ ۱۹۸۶ء ص ۳۰۔ ۳۱ دکن میں اردو (مولفہ نصیر الدین ہاشمی) اور حیدرآباد کے شاعر (مولفہ خواجہ حمید الدین شاہد) میں بھی سید نوازش علی لمعہ کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن کسی نے اقبال سے ان کی مراسلت کا تذکرہ نہیں کیا۔ (اکبر رحمانی)

تلخیص و تبصرہ

مدینہ منورہ کی تاریخی مساجد

از کلیم صفات اصلاحی

جب مکہ مکرمہ میں قریش کی ایذا رسانیاں حد سے بڑھ گئیں تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم ایزدی وہاں سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ اس سفر میں آپؐ کے یار غار حضرت ابوبکر صدیقؓ عبداللہ بن قحافہ بھی ساتھ تھے۔ ۸ ربیع الاول کو آپؐ قبا پہنچے جس کی صراحت متعدد مورخین نے کی ہے اور یہیں مذہب اسلام کی پہلی مسجد کی بنیاد رکھی گئی۔ بلکہ قرآنی الفاظ میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ مسجد تقویٰ و طہارت کی بنیاد پر رکھی گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبا میں سب سے پہلے کلثوم بن ہدم کو اپنے قیام و پذیرائی کا شرف بخشا اور وہیں مسجد تعمیر کی۔ قبا کا علاقہ مدینہ منورہ کے مغرب جنوب میں واقع ہے۔ مسجد قبا کی قدیم تعمیر مربع تھی جس کے ایک حصہ کی لمبائی ۴۰ میٹر ہے۔ اس میں ایک قبہ تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خاص رسول اکرمؐ کی اونٹنی کی جائے نشست تھی۔ کوفی خط میں منقش ایک پتھر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر نو ۴۳۵ھ میں کسی مملوک سلطان نے کی تھی۔ موجودہ چھت والے حصے میں کئی قبے اور چھ برآمدے ہیں اور یہ حرم نبوی سے میانہ چال سے نصف گھنٹہ کی مسافت پر واقع ہے۔

مسجد قبا کی بنیاد حضور پاکؐ کے دست مبارک سے اس وقت رکھی گئی جب آپؐ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے جا رہے تھے، مدینہ منورہ میں بنائی گئی یہ سب سے پہلی مسجد ہے۔ جس کی تعمیر میں آپؐ نے بہ نفس نفیس حصہ لیا۔ پھر خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ نے اس میں تجدید و اضافہ کیا۔

خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز جب مدینہ منورہ کے امیر ہوئے تو مسجد بوسیدہ ہو رہی تھی اس لیے انھوں نے اس کی مرمت کرائی اور ایک موذن خانہ بھی بنوایا۔ غالباً یہ ۸۷ھ سے ۹۳ھ کے درمیان کا واقعہ ہے۔ ۴۳۵ھ میں اس مسجد میں منبر بنایا گیا اور ۵۵۵ھ میں کمال الدین اصفہانی نے اس کی تعمیر نو کی خدمت انجام دی۔ ۱۰۶۷ھ سے ۱۲۳۲ھ تک کی درمیانی مدت میں اس مسجد کی متعدد بار تجدید ہوئی۔ دولتِ عثمانیہ کے زمانہ میں بھی کئی مرتبہ اس کی تجدید ہوئی اور اس عہد کی آخری تعمیر سلطان محمود ثانی اور اس کے فرزند سلطان عبد المجید کے ہاتھوں ۱۲۴۵ھ میں ہوئی۔ پھر سعودی حکومت نے قدیم طرز تعمیر کے بقاء و تحفظ کے ساتھ اس کی تعمیر و تجدید کا منصوبہ بنایا۔ جس میں سرفہرست خادم الحرمین الشریفین کے عہد کی تعمیر و توسیع ہے جس کے حسن و جمال اور آب و تاب کی مثال عہد ماضی میں نہیں ملتی۔ ۸ ربیع صفر ۱۴۰۵ھ بروز جمعرات کو شاہ فہد نے اس مسجد کی توسیع کا سنگ بنیاد رکھا اور ۲۸ صفر ۱۴۰۷ھ کو تعمیری سلسلہ کے اختتام کے بعد مسجد کی زیارت کا شرف حاصل کیا اور اس کی عمدہ تعمیر و زیبائش پر اطمینان کا اظہار کیا۔

مسجد قبا کی اس مبارک توسیع کے بعد اس کا توسیع شدہ رقبہ ۱۳۵۱۸ میٹر ہو گیا ہے۔ جس میں مسجد کے خارجی صحن سمیت بیس ہزار نمازیوں کی گنجائش ہو گئی ہے۔ مسجد کے باہر کا وہ حصہ جس میں پتھر لگا ہوا ہے۔ ۴،۲۴۴ میٹر پر مشتمل ہے اور عورتوں کے مخصوص مصلے کا رقبہ ۴۳۲، میٹر ہے۔ بایں طور مسجد کا اجمالی رقبہ ۵۳۶۵، ہوتا ہے۔ جب کہ توسیع سے قبل اس مسجد کا رقبہ ۱۳۵۲ میٹر پر محیط تھا۔

طرزِ تعمیر: یہ مسجد قدیم اسلامی طرز تعمیر کے مطابق سُرخ مضبوط اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔ اس کی چھت میں ۵۶ چھوٹے چھوٹے قبے ہیں۔ جن کا قطر چھ میٹر ہے اور چھ بڑے بڑے قبے ہیں جن کا قطر ۱۲ میٹر ہے۔ مسجد میں چار مینار ہیں، اس کی دیواروں کو ۲ر۳ میٹر اونچائی

تک موزیک سے پلاسٹر کیا گیا ہے۔ دروازے خالص عربی طرز کے ٹیک کی لکڑیوں سے بنائے گئے ہیں۔ کھلا ہوا صحن بھی پتھروں اور رنگین موزیک سے مزین کیا گیا ہے۔ کھلے ہوئے صحن کو جدید سائنسی آلات کے ذریعہ متحرک الکٹرانک خیموں سے ڈھک دیا گیا ہے تاکہ نمازی سورج کی تپش سے مامون و محفوظ رہ سکیں۔ مسجد قبا کو مکمل طور پر ایر کنڈیشنڈ کیا گیا ہے اور روشنی کا بھی اچھا انتظام ہے۔ امام و موذن کی رہائش گاہ بھی تعمیر کی گئی ہے۔ ادھر حال میں مسجد کے قدیم حصہ کو عمدہ قسم کے سعودی قالینوں سے سجایا گیا ہے۔ جس کے بال ۱۶ ملی میٹر لمبے ہیں۔ یہ قالین دو طرح کے ہیں بعض پر محرابی شکلیں ہیں اور بعض سادے ہیں تاہم ان پر صفوں کے لحاظ سے لکیریں بنی ہوئی ہیں، تاکہ نمازیوں کو اپنی صفیں درست کرنے میں آسانی ہو۔ مسجد قبا کی صفائی و ستھرائی کا ٹھیکہ مشہور سعودی کمپنی بن لادن کو دیا گیا ہے۔ جس پر سالانہ تقریباً ۲۴ لاکھ ۹۵ ہزار۔ اسٹوریال کا صرفہ ہوتا ہے۔

مدینہ منورہ میں متعدد مسجدیں تاریخی نوعیت کی حامل ہیں جو تین قسموں پر مشتمل ہیں:

۱۔ وہ مساجد جو ما قبل ہجرت تعمیر ہوئیں ۲۔ ہجرت کے بعد کی تعمیر شدہ مساجد ۳۔ آنحضورؐ کی وفات کے بعد کی مسجدیں۔

ان مسجدوں کے فلک بوس مینارے آج بھی اس سرزمین کے نور اسلام کا سرچشمہ ہونے اور اسلامی دعوت و تبلیغ اور دینی جد و جہد کے مرکز ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ موجودہ سعودی حکومت نے شروع ہی سے مساجد کی طرف خاص توجہ کی ہے اور ان کی توسیع و مرمت کا خاص اہتمام کیا ہے۔ شاہ عبد العزیز اور شاہ فہد بن عبد العزیز کا دور حکومت اس کی شاندار مثال ہے۔ انھوں نے نئی مساجد کی تعمیر کے ساتھ ہی تاریخی مسجدوں کی تجدید کی طرف بھی توجہ دی۔ اس سلسلے میں بعض تاریخی مساجد کو شہید کر کے ان کی از سر نو تعمیر و مرمت بھی کی گئی۔ جیسے مسجد

علی بن ابی طالب اور مسجد جمعہ وغیرہ۔ ان کی تعمیر و ترمیم کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ مسجد کی قدیم شکل باقی رہے۔ یہ کام نہایت ماہر انجینیر اور آرکیٹکٹ کے توسط سے انجام پایا ہے۔ اسی طرح مسجد سیدنا ابوبکر، مسجد غمامہ، مسجد سیدنا عمر، مسجد فتح وغیرہ میں بھی جزوی ترمیمات کی گئیں۔

ذیل میں مدینہ منورہ کی انہیں مسجدوں کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے:

مسجد عمر بن الخطابؓ یہ مسجد نبوی سے قریب اور قبلہ کی سمت واقع ہے۔ لیکن تاریخی مصادر میں اس مسجد کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ ممکن ہے یہ وہی مسجد ہو جو آل ورہ کے مقام پر تعمیر ہوئی تھی اور اسی مقام پر حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے عہد خلافت میں عید کی نماز ادا کی تھی۔ اسی بنا پر اس کو خلیفہ ثانی کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو، مسجد کی جو تعمیر سلطان محمود العثمانی نے ۱۲۵۴ھ میں کی تھی اس میں قدیم طرز تعمیر کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اس کا رقبہ ۵۱ر۳۲۲ مربع میٹر ہے۔ اب وزارت حج و اوقاف نے جب اس مسجد کی تعمیر نو کا منصوبہ بنایا تو اس میں مینار کا بھی اہتمام کیا۔ لیکن مسجد کے قدیم طرز کا مکمل لحاظ رکھا۔

مسجد غمامہ یہ مناخہ کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس کی تعمیر میں یکساں قسم کے پتھروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ مسجد کا طول ۲۶ میٹر، عرض ۱۳ میٹر اور اونچائی ۱۲ میٹر ہے اور اس کی دیواروں کی چوڑائی ۵ر۱ میٹر ہے۔ اس کی صحیح تاریخ تعمیر کا علم نہیں ہے۔ البتہ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں سلطان حسن قلاؤن نے اس کی تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بعد چودہویں صدی ہجری میں سلطان عبدالحمید ثامن نے اس کی تجدید کرائی۔ اس میں لکڑی کا ایک تختہ ہے۔ جس پر وضاحت سے یہ مرقوم ہے کہ سلطان عبدالحمید خاں نے بھی اس کی تجدید کرائی تھی۔ اس وقت مسجد کا موجودہ رقبہ ۱۵ر۳۰۷۷ مربع میٹر ہے۔

سعودی حکومت نے اور مساجد کی طرح اس مسجد کی مرمت و تحفظ کا انتظام بھی اپنے ذمہ

لیا ہے۔ ۱۳۸۰ھ سے اب تک اس مسجد کی تعمیر پر سعودی حکومت بیس لاکھ ریال خرچ کر چکی ہے۔

مسجد ابوبکرؓ بعض تاریخی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس مقام پر اپنے دور خلافت میں عید کی نماز پڑھی تھی اسی بنا پر اس مسجد کا انتساب حضرت ابوبکرؓ کی جانب کیا گیا ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرتؐ نے بھی عید کی نماز اس مقام پر ادا کی تھی۔ اسی لیے حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے مسجد غمامہ اور مسجد علی کے ساتھ اس مسجد کی بھی تعمیر کرائی اور اس کی تجدید ۱۲۵۴ھ میں سلطان محمود عثمانی کے دور حکومت میں بھی ہوئی۔ اس کی موجودہ عمارت سلطان محمود ہی کی تعمیر و تجدید شدہ ہے۔ یہ مسجد غمامہ کے شمال مغرب میں ہے۔ اس کا موجودہ رقبہ ۹۵ر۲۳۰ مربع میٹر ہے۔

بعد میں اس مسجد کی ضروری ترمیمات اس کے قدیم طرز تعمیر کے مطابق نہایت اہتمام سے کرائی گئی... اور عمارت میں یکساں اور متوازن پتھروں کا استعمال کیا گیا تاکہ اس کی قدیم خصوصیات برقرار رہیں۔ اس میں ایک بڑا گنبد اور ایک مینارہ بھی بنوایا گیا ہے۔

مسجد علی بن ابوطالبؓ نبی کریمؐ کا معمول تھا کہ عید کی نماز مختلف مقامات پر ادا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں پہلی عید الفطر کی نماز آپؐ نے حکم بن عدار کے صحن میں ادا فرمائی۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں جامع مسجد علیؓ واقع ہے۔ اس مسجد کا حضرت علیؓ کی جانب انتساب غالباً اس وجہ سے ہے کہ حضرت علیؓ نے لوگوں کو عید کی نماز اسی مقام پر پڑھائی۔ مسجد علیؓ مسجد غمامہ کے شمال میں واقع ہے جو حرم نبوی سے بالکل قریب ہے۔ کتب تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے اس کو اپنے عہد گورنری میں تعمیر کرایا تھا اور اس وقت ولید بن الحکم کی حکومت تھی اور اسی کے دور میں حرم نبوی کی توسیع ۹۱-۹۳ھ میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد امیر المدینہ زین الدین منصوری نے ۸۸۱ھ میں اس کی تعمیر نو کی خدمت انجام دی۔ غالباً اس کی

موجودہ تعمیر عہد عثمانی (ترکی دور) میں ہوئی ہوگی۔ اس میں یکساں پتھروں اور چونے کا استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ سے عمارت نہایت مستحکم ہے۔ مسجد کا کل رقبہ ۲۳۳ر۱۹ مربع میٹر ہے۔ حال میں مسجد کو منہدم کرکے دوبارہ قدیم طرز تعمیر کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی تعمیر کی گئی ہے۔

مسجد الرایہ (جھنڈے والی مسجد) اسے مسجد ذباب بھی کہتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں ایک چھوٹے پہاڑ پر یہ مسجد واقع ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف روایتیں ہیں۔ ایک قول ہے کہ یمن کے ایک شخص نے جن کا نام ذباب تھا مروان کے گورنر کو قتل کر دیا تو مروان نے اس کے بدلہ میں اس کو اسی مقام پر قتل کیا۔ غالباً اسی لئے یہ مسجد ذباب کے نام سے مشہور ہوئی۔ حضرت ابو سعیدؓ خدری سے مروی ہے "نبی کریمؐ نے کسی موقع پر اسی جگہ قیام فرمایا تھا جہاں مروان نے اس یمنی کا قتل کرایا تھا اسی لئے بعد میں اس جگہ مسجد بنا دی گئی"۔

یہ بات معروف ہے کہ غزوۂ خندق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام مسجد فتح کی سمت میں تھا اور غزوۂ تبوک میں بھی آپؐ نے یہاں پڑاؤ کیا تھا اور اپنے لشکر کو ثنیۃ الوداع میں ٹھہرایا تھا اور عبداللہ بن ابی نے بھی آپؐ کی معیت میں ذباب کی سمت نشیبی حصہ میں اپنے لشکر کو اتارا تھا۔ اور یزید بن ہرمز بھی خاص ذباب پر موالیوں کا علم لئے ہوئے تھے۔ ممکن ہے اسی وجہ سے اس کو مسجد رایہ کے نام سے شہرت ملی ہو۔ یہ مسجد اس وقت شاہراہ العیون پر پڑتی ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۲۳ میٹر ہے۔

ذیل میں مساجد سبعہ (سات مسجدیں) کے بارے میں کچھ معلومات پیش ہیں۔

۱۔ مسجد فتح یہ جبل سلع کے ایک حصہ میں ہے جو عہد نبوی ہی میں تعمیر ہو چکی تھی۔ البتہ اس کی موجودہ عمارت پتھر اور چونے کی ہے۔ اس کی لمبائی ۸ میٹر، چوڑائی ۳ میٹر ہے اور سطح زمین سے اس کی اونچائی بھی ۳ میٹر ہے اور ۱۲ سیڑھیوں سے گزر کر اس مسجد کے صحن میں داخل ہوتے ہیں۔ بلندی پر اس مسجد کی تعمیر کا سبب روایتوں میں یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو

غزوۂ احزاب میں کفار و مشرکین کے مقابلے میں بلندی کے مقام سے فتح و نصرت سے ہمکنار کیا تھا۔ اسی مناسبت سے اس کا نام مسجد فتح رکھا گیا۔ قرین قیاس یہ ہے کہ اس میں پتھر، اینٹ اور کھجور کی شہتیروں کا استعمال کیا گیا ہوگا۔ حسین بن ابو الہیجاء نے ۵۷۵ھ میں اس کی تعمیر نو کی خدمت انجام دی۔ جس کے بعد اس کا رقبہ ۵۰ر۹۸ مربع میٹر وسیع ہوگیا۔ اس کے بعد اس کے قبلہ رو واقع تمام مسجدوں کی بھی اسی نے تجدید کرائی اور اس پورے مجموعۂ مساجد کو مساجد فتح کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

۲۔ مسجد سلمان فارسیؓ یہ مساجد فتح میں سب سے بلندی پر واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۴۶ر۹ مربع میٹر ہے۔

۳۔ مسجد علی بن ابو طالبؓ مسجد سلمان فارسی کے قبلہ سمت میں یہ مسجد واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۴۰ر۳۷ مربع میٹر ہے۔

۴۔ چوتھی مسجد اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی نشان باقی ہے۔

۵۔ مسجد ابو بکرؓ جبل سلع کے مشرقی جانب کے آخر میں پتھر سے بنی ہوئی عمارت کے کچھ نشانات موجود ہیں۔ جس کے باب میں روایت ہے کہ یہ حضرت ابو بکرؓ صدیق کی مسجد تھی جو پتھر اور چونے سے تعمیر کی گئی ہے۔ اس کا کل رقبہ ۳۵ر۲۱۵ مربع میٹر ہے۔

۶۔ مسجد عمرؓ ٹھیک اسی مقام پر قبلہ کی سمت مسجد عمرؓ بن الخطاب بھی واقع ہے۔

۷۔ مسجد سیدہ فاطمہؓ اسی علاقہ میں مسجد سیدہ فاطمہ بھی ہے۔ ان ساتوں مساجد میں اس کا رقبہ سب سے کم ہے یعنی ۹۲ر۳۵ مربع میٹر ہے۔

ان مسجدوں کی تعمیر و تجدید متعدد دفعہ ہوئی مگر ہمیشہ ان کی تاریخی اہمیت کی بنا پر ان کی پرانی شکل باقی رکھنے کا اہتمام کیا گیا۔

مسجد ابوذرؓ | یہ مسجد سجدہ کے نام سے بھی معروف ہے۔ مشہور باغ نجدی کے قریب واقع ہے۔ جو مدینہ ایرپورٹ جانے والی قدیم سڑک پر واقع ہے اور ایرپورٹ کی جدید سڑک کے جنکشن کے پاس مسجد نبوی کے پورب میں جنت البقیع کے پچھم کی جدید تعمیر شدہ سڑک پر واقع ہے۔ جس کو شارع حضرت ابوذرؓ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کا نام مسجد سجدہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ نبی کریمؐ نے یہاں دو رکعت نماز ادا کی تھی اور ایک رکعت میں طویل سجدہ کیا تھا۔ پھر آپؐ نے فرمایا جبریلؑ نے مجھ کو مژدہ سُنایا کہ جس نے مجھ پر درود بھیجا اللہ تعالیٰ اس پر درود بھیجتا ہے اور جس نے میری سلامتی کی دعا کی اللہ تعالیٰ اس پر سلامتی بھیجتا ہے"۔ اس کو مسجد طریق السقالہ بھی کہتے ہیں۔

سعودی عہد حکومت میں اس کی عمارت کی تجدید نئے طرز پر کرائی گئی۔ چنانچہ اس کے مغربی شمالی حصے میں ایک مینار بنایا گیا۔ اس کا موجودہ رقبہ ۱۸ ر ۱۸۲ مربع میٹر ہے۔

مسجد اجابہ | اس مسجد کے ساتھ ایک واقعہ وابستہ ہے جس کو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ عامر بن سعد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز عالیہ سے تشریف لارہے تھے جب مسجد بنی معاویہ سے آپؐ کا گزر ہوا تو آپؐ نے اس میں دو رکعت نماز ادا کی اور ہم نے بھی آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی۔ آپؐ نے طویل دعا فرمائی پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کی دعا کی جن میں دو قبول ہوئیں اور ایک سے روک دیا گیا۔ میں نے پہلی دعا مانگی کہ میری امت عذاب قحط سے دوچار نہ کی جائے۔ سو وہ قبول ہوئی۔ دوسرے میں نے عرض کیا میری امت غرق آب کے ذریعہ ہلاک نہ کی جائے یہ بھی سُن لی گئی تیسری دعا یہ کی کہ میری امت آپس میں خوں ریزی نہ کرے۔ یہ دعا نہیں سُنی گئی۔

مسجد کا اصل حصہ زمینی سطح سے بلندی پر ہے۔ دولت عثمانیہ کی عمارتوں کی طرح یہ بھی پتھر اور

چونے سے بنائی گئی تھی۔ سعودی عہد حکومت میں پوری مسجد منہدم کرکے جدید طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔ اس کا موجودہ رقبہ ۸۰ ر ۶۵۵ مربع میٹر ہے

مسجد بغلہ | اس کو مسجد بنی ظفر بھی کہتے ہیں۔ یہ جنت البقیع کے مشرقی جانب حرۃ الشرقیہ کے سمت میں ہے۔ مسجد بغلہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ نبی کریمؐ کا خچر یہاں باندھا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سموں کے نشانات وہاں کے پتھروں میں اب بھی موجود ہیں۔ واللہ اعلم۔ یہ بات بھی ذکر کی جاتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس پتھر پر جلوہ افروز ہوئے تھے جو مسجد بنی ظفر میں نصب ہے۔ زیاد بن عبداللہ نے اس پتھر کو اکھاڑنے کا حکم دیا تھا تو بنی ظفر کے سن رسیدہ لوگ آئے اور انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر تشریف فرما ہوئے تھے۔ چنانچہ اس نے پتھر کو اسی مقام پر رکھوا دیا۔ اس مسجد کے اردگرد متعدد نشانات ہیں۔ ایک تو قبلہ کی سمت پاؤں کا نشان ہے جس کے باب میں کہا جاتا ہے کہ یہ خچر کے کھر کا نشان ہے۔ ایک دوسرے پتھر کے نشان کے باب میں کہا جاتا ہے کہ انگلیوں کے نشان ہیں۔ قبلہ کی جانب سے مسجد کی لمبائی ۱۲ فٹ اور اتنی ہی مشرق سے مغرب تک بھی ہے۔ اس طرح یہ مسجد چوکور ہے۔ اس کی عمارت پتھر سے بنی ہے اور اس کی چھت میں ایک گنبد ہے جو ترکی عہد کا تعمیر کردہ ہے۔

مسجد فضیخ یا مسجد شمس | محلہ عوالی کے مشرق میں واقع یہ مسجد نہایت مضبوط اور مرتفع ہے چھت کی لمبائی ۱۹ میٹر اور عرض ۴ میٹر ہے۔ مسجد میں ۵ قبے اور ایک محراب ہے۔ اس کی عمارت چونے اور پتھر کی ہے اور یہ دولت عثمانیہ کے عہد کی تعمیر کردہ ہے۔ چونکہ یہ نہایت بلندی پر واقع ہے اس لئے طلوع آفتاب کے وقت اسکی پہلی کرنیں اس پر پڑتی ہیں اس بنا پر اس کو مسجد شمس کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مسجد فضیخ اس لئے کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوایوب انصاریؓ اور ان کے ساتھ انصار کی ایک جماعت کو حرمت شراب کی اطلاع ملی تو انہوں نے اسی مقام پر شراب کی مشکیں جلا ڈالیں۔ حضور اکرمؐ نے اپنے محاصرۂ بنونضیر کے دوران اسی جگہ چھ دن نماز

پڑھی تھی۔ مسجد نبوی سے محلہ عوالی کے راستہ سے اس مسجد تک جایا جاتا ہے۔ اس کا موجودہ رقبہ ۹۱ر۹ء۳۳ مربع میٹر ہے۔

مسجد سقیا مدینہ منورہ میں یہ مسجد حرۂ "وبرہ" یعنی حرۂ غربیہ کی ایک سمت میں واقع ہے۔ اس کی موجودہ شہرت قبۃ الرؤوس سے ہے۔ جو باب العنبریہ سے مکہ کی طرف نکلنے کے بعد دور ہی سے نظر آتا ہے۔ نبی کریمؐ نے اس جگہ نماز ادا کی اور اہل مدینہ کے لئے برکت کی دعا فرمائی جس میں آپؐ نے فرمایا تھا "مدینہ منورہ حرم مکہ کی طرح ہے"۔ ازسر نو قدیم بنیادوں پر اس کی تعمیر کے بعد جب اس کے نشانات مٹ گئے تو ترکی عہد میں اس کی تجدید ہوئی اور مضبوط پتھروں سے اس کی عمارت بنائی گئی۔ اس کی چھت گنبد نما ہے۔ اس کا موجودہ رقبہ ۱۵ر۷۷ مربع میٹر ہے۔

مسجد بنی حرام مدینہ منورہ سے مسجد قبلتین جانے والے راستہ پر جبل سلع کے نشیبی حصہ میں مساجد سبعہ کے قریب یہ مسجد واقع ہے۔ مدینہ منورہ کی گورنری کے زمانہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے دو قدم آدم کے برابر مسجد کی عمارت بلند کروائی۔ پہلے مسجد کی چھت لکڑی اور کھجور کی ٹہنیوں پر مشتمل تھی۔ بعد میں اس پر چھت پٹوائی گئی۔ سعودی عہد میں اس کو منہدم کرکے دوبارہ جدید انداز پر اسے بنایا گیا ہے۔ مسجد کا موجودہ رقبہ ۳۵ر۲۲ مربع میٹر ہے۔

مسجد بنی قریظہ محلہ حرۂ شرقیہ کے قریب یہ مسجد متعدد گھروں اور بنی قریظہ کے بعض موقوفہ مکانات کے مجموعہ پر مشتمل ہے۔ ولید بن عبدالملک کے عہد حکومت میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کی تجدید کرائی۔ ترکی عہد میں دوبارہ اس کی تجدید ہوئی۔ اس کی دیواریں پتھر کی ہیں اور چھت گنبد نما ہے۔

مسجد مشربۂ ام ابراہیم مشربہ باغ کو کہتے ہیں۔ روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے مشربۂ ام ابراہیم میں نماز ادا کی۔ حضور اکرمؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ یہیں پیدا ہوئے تھے۔ یہ باغ آپؐ کے صدقات میں سے تھا اور اسی زمانے سے اس باغ میں مسجد قائم ہے اور اسی نام سے آج تک معروف ہے۔

(ماخوذ از مجلۃ الحج، مکہ مکرمہ، اگست ۱۹۹۹ء)

وفیات

مولانا حکیم زماں حسینی

افسوس ہے کہ ۲۳ر دسمبر کو کلکتہ کے مشہور و باوقار عالم مولانا حکیم زماں حسینی وفات پاگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

وہ علم و عمل میں پختگی و استقامت، زہد و اتقا، میانہ روی اور ذاتی وجاہت کی بنا پر کلکتہ کے علمی و دینی حلقوں میں بہت مقبول تھے، ان کا تعلق کلکتہ سے تھا مگر اپنی علمی و دینی وجاہت متوازن شخصیت، پاکیزہ سیرت، اصابت رائے اور معاملہ فہمی کی وجہ سے پورے ملک میں باوزن اور قابل اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ ان کے دل میں قوم و ملت کا درد تھا، اس لئے مسلمانوں کی موجودہ تباہی اور زبوں حالی سے بہت بے چین رہتے تھے۔ کلکتہ کے علمی و تعلیمی اداروں کے علاوہ وہ ہندوستان کے بھی ممتاز دینی و تعلیمی اداروں اور قومی و ملی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالعلوم دیوبند جیسے عالمگیر شہرت کے حامل اداروں کے عرصے سے اہم رکن تھے اور ان کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بھی سرگرم ممبر تھے۔ دارالمصنفین سے مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، ہم لوگوں میں سے کوئی اگر کلکتہ پہنچ جاتا تو بہت خوش ہوتے اور لطف و مدارات سے پیش آتے۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، ان سے غیر معمولی عقیدت ہی کی بنا پر اپنے نام کے ساتھ حسینی لکھتے تھے، دینی علوم میں اچھی دستگاہ تھی، فن تفسیر سے زیادہ مناسبت تھی، مفسر قرآن کہلاتے تھے، قدرت نے حسن بیان اور تاثیر کی نعمت بخشی تھی، ان کے درس قرآن کی شہرت

تھی، برسوں کولوٹولہ کی مسجد میں قرآن پاک کی تفسیر بیان کی، روزنامہ آزاد ہند کے ہفتہ وار ایڈیشن میں ان کی تفسیر برابر شایع ہوتی تھی۔ ان کو حکمت و اسرارِ دین سے بھی اچھی واقفیت تھی جس کا اندازہ ان کی گفتگو اور تحریر سے ہوتا تھا۔

وہ بڑے حاذق طبیب تھے، حذاقت کی وجہ سے ان کے مطب میں کثرت سے مریض آتے تھے، طب و حکمت کی مصروفیت اور قومی و ملی اشغال سے تعلق کے باوجود مطالعہ و تصنیف کا مشغلہ بھی جاری تھا، بعض جرائد و رسائل میں ان کے مضامین چھپتے تھے، جن کا ایک مجموعہ "مقالات شریعت و حکمت" کے نام سے کتابی صورت میں شایع ہوا تھا۔ چند اور رسائل بھی شایع ہوئے، ان کے قلم سے سب سے اہم اور بیش قیمت تحریر "سیرت شیخ ابن سینا کے بعض پہلو اور القانون فی الطب کا مطالعاتی جائزہ" کے نام سے نکلی، یہ دراصل ان کا وہ مبسوط مقالہ تھا جو ایشیاٹک سوسائٹی کے سیمنار کے لئے لکھا گیا تھا۔ مولانا حکیم زماں صاحب اگرچہ کم لکھتے تھے مگر جو کچھ لکھتے تھے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد لکھتے تھے اس لئے ان کی تحریریں پُرمغز ہوتی تھیں۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا، علمی و دینی رسالے اور نئی مطبوعات برابر پڑھتے تھے، میں غالباً ۱۹۷۶ء میں پہلی مرتبہ ان سے کلکتہ میں ملا تو فرمایا کہ میں تمہارے مضامین برابر پڑھتا رہا ہوں، سمجھتا تھا کہ تم معمر ہوگے۔ وہ مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی کے انتقال کے بعد رسالۂ برہان کے نگراں ہوگئے تھے۔

حکیم صاحب قدیم تہذیب و شرافت کی یادگار اور اسلاف کی علمی و دینی روایتوں کے امین تھے، اللہ تعالیٰ دین و ملت اور علم و حکمت کے اس خادم کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین!

مولانا محمد اسحاق سنبھلی

۷؍ جنوری کو مولانا اسحاق سنبھلی کی رحلت ہوگئی، وہ ایک عالم دین، جنگ آزادی کے مجاہد،

جمعیۃ علمائے ہند اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے اور برسوں ریاستی قانون ساز کونسل اور پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے۔

مولانا کی زندگی جہد و جہاد سے عبارت تھی، عوام کی خدمت ان کا نصب العین تھا، لوگوں کا کام کرکے خوش ہوتے تھے، بڑے خلیق اور ملنسار تھے۔

آزادی سے پہلے انہوں نے استخلاص وطن کے لئے قربانی دی اور آزادی کے بعد فرقہ پرستوں اور رجعت پسندی کے خلاف صف آرا رہے، ان کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کو بے نقاب کیا، مولانا کی زندگی اقلیتوں کے حقوق کی بازیابی کے لئے جدوجہد اور سیوکلرازم، انصاف اور جمہوریت کا پرچم بلند کرنے میں بسر ہوئی۔ وہ حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار تھے، جس طرح جمعیۃ علماء کے زیرِ قیادت مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کام میں حصہ لیتے تھے، اسی طرح وطن عزیز کی سالمیت اور استحکام کے لئے بھی ہمیشہ ساعی رہتے۔

مولانا اردو تحریک کے قائدین میں تھے، اس کے خلاف ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کے خلاف ہمیشہ لڑتے رہے۔ عرصہ تک ریاستی انجمن کے جنرل سکریٹری تھے۔

مولانا اسحاق سنبھلی دارالمصنفین کے کاموں کے بڑے قدرداں تھے، چند برس پہلے اپنی پارٹی کے کام سے اس نواح میں آئے تو وقت نکال کر یہاں بھی تشریف لائے اور دارالمصنفین کے تمام شعبوں کو دیکھ کر اپنی مسرت ظاہر کی۔

موجودہ لیڈروں اور قومی کارکنوں کی طرح ان میں مصلحت پسندی اور نام و نمود کی ہوس نہ تھی، جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اسے بے دھڑک کہہ دیتے تھے، افسوس ہے کہ ملک سے ایسے مخلص، بے غرض، جرات و ہمت والے اور نام و نمود سے بے زار لیڈر ایک ایک کرکے رخصت ہوتے جارہے ہیں اور ان کی جگہ پُر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی بے لوث قومی و ملی خدمات کا

صلہ دے اور ان کی مغفرت فرمائے آمین!

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کے ارتحال کی افسوس ناک خبر تاخیر سے ملی، انہوں نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو سنگاپور میں داعی اجل کو لبیک کہا، ان کا وطن تامل ناڈو کی مشہور ریاست آرکوٹ (نارتھ) کا ایک قصبہ چیر دتاپور تھا۔ یہیں وہ ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا، ندوہ سے فراغت کے بعد پونے یونیورسٹی سے فارسی اور اردو میں ایم۔ اے کیا۔

درس و تدریس کا آغاز بمبئی کے مشہور تعلیمی ادارے انجمن اسلام سے ہوا، اس کے ریسرچ سنٹر سے بھی وابستہ رہے اور عرصہ تک مہاتما گاندھی میموریل سنٹر کی ہندوستانی پرچار سبھا سے منسلک رہے، جس کے ڈائریکٹر پروفیسر عبدالستار دلوی تھے۔ اسی زمانے میں ہمارے سابق رفیق مولانا عبدالرحمن پرواز اصلاحی کا تعلق بھی اس سینٹر سے تھا، انہی کے ہم راہ راقم نے پہلی بار ان دونوں حضرات سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، دونوں دارالمصنفین کے بڑے قدر داں اور خیر خواہ تھے اس لئے مجھ سے بڑے اخلاص، محبت اور گرم جوشی سے ملے اور توقع سے زیادہ میری پذیرائی کی۔

آخر میں ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کا تعلق بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ عربی سے ہوگیا، اس سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد بمبئی کی ہنگامہ خیز زندگی سے الگ رہ کر وہ خاموشی سے علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں میں مشغول رہتے تھے جس سے ان کو بڑا شغف تھا، تحریر و تصنیف کا بھی اچھا ذوق اور خاص سلیقہ تھا جس کا ثبوت ان کی تصنیفات ہیں جو تلاش، تحقیق اور محنت و جستجو سے لکھی گئی ہیں

ان کی کتاب "لکھنؤ کی لسانی خدمات" شایع ہوئی تو علمی حلقوں میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی،

دوسری کتابیں "اردو کی چند نایاب مثنویاں" "اردو کے چند نامور ادیب اور شاعر" "ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کے تجارتی تعلقات" اور "کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات" بھی ان کی تلاش و تفحص کا نتیجہ ہیں۔ حال ہی میں ان کی کتاب "انجمن کے چند روشن چراغ" شایع ہوئی تو بمبئی کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کو پسند کیا گیا۔

ڈاکٹر حامد اللہ متین، سنجیدہ اور خاموش طبع شخص تھے، اپنے کام سے سروکار رکھتے، دوسروں کا شکوہ و شکایت نہ کرتے، ان کی وفات سے اردو اپنے ایک عاشق و شیدائی اور لایق عالم و محقق سے محروم ہوگئی، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس نصیب کرے اور اعزہ و متعلقین کو صبر و قرار بخشے آمین!

مولوی احتشام علی ندوی

افسوس ہے کہ ۲۰ رمضان المبارک کو مولوی احتشام علی ندوی اچانک چل بسے، ان کی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوئی، وہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم کے چہیتے شاگردوں میں تھے انہی کے ایما سے جامعہ ملیہ میں داخلہ لیا، مولانا عبدالسلام صاحب نے لکھنؤ میں ادارۂ تعلیمات اسلام کی داغ بیل ڈالی تو اس کی تشکیل میں یہ بھی ان کے معاون رہے اور ان کی نگرانی میں صحابۂ کرام کے حالات میں مختصر اور عام فہم بعض کتابچے لکھے۔

دارالمصنفین سے ان کا تعلق دو بار رہا، پہلی دفعہ وہ مولانا عبدالسلام قدوائی کے ساتھ آئے اور محاسب کی ذمہ داری سنبھالی ان کے انتقال کے بعد انہوں نے بھی یہاں سے تعلق منقطع کر لیا تاہم دارالمصنفین سے ان کے لگاؤ میں کمی نہیں آئی جناب سید صباح الدین صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد پھر وہ دارالمصنفین تشریف لائے اور پریس کی نگرانی اور دوسرے انتظامی امور ان کو سپرد کئے گئے، لیکن اس دفعہ ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ دو تین برس سے کمزوری بہت بڑھ گئی تھی اور ضعف بصر کی شکایت بھی ہوگئی تھی۔ ان کا انتقال دارالمصنفین ہی میں ہوا، مگر تدفین ان کے وطن رحیم آباد میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ درجات بلند کرے اور اہلیہ و اعزہ کو صبر جمیل عطا کرے آمین!!

"ض"

مطبوعات جدیدہ

غزوات نبوی کی اقتصادی جہات از پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۹۱، قیمت ۷۵ روپے، پتہ: ادارہ مطالعات اسلامی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔

فاضل مصنف اس سے پہلے عہد نبوی کی ابتدائی مہمیں، تنظیم ریاست وحکومت اور نظام حکومت وغیرہ سیرت نبوی کے اہم مباحث پر قابل قدر علمی وتحقیقی تحریریں سپرد قلم کرچکے ہیں، زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں انہوں نے عہد نبوی کے غزوات وسرایا میں حاصل ہوئے مال غنیمت اور مدینہ کے مسلمانوں کی اقتصادی صورت حال کے متعلق بعض ایسے پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جن سے عموماً سیرت نگاروں نے تعرض نہیں کیا تھا۔ اس کا ایک اہم مقصد مستشرقین کے بعض وسوسوں اور الزامات کا ازالہ بھی ہے جو مسلسل یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ ہجرت کے بعد مدنی زندگی میں مسلمانوں کی معاشی بدحالی اور مالی فوائد کی خواہش ان غزوات وسرایا کا خاص محرک رہی، فاضل مصنف نے نہایت دیدہ ریزی سے قدیم وجدید سیرت نگاروں کے بیانات کی روشنی میں ہر سال کے غزوات اور ان سے حاصل ہونے والے اموال غنیمت کی جزئیات اور تقسیم کے مفصل جائزہ وتجزیہ سے ثابت کیا ہے کہ اس باب میں آمدنی اور منافع کا تناسب صفر کے برابر ہے اور یہ کہ مسلمانوں کی اصل آمدنی کے ذرائع ووسائل پرامن تھے، معروضی وغیر جذباتی اسلوب، بلند پایہ تحقیقی معیار اور منفرد موضوع نے اس مختصر کتاب کو بیش قیمت بنادیا ہے، کتاب کا انتساب عہد جدید میں فن سیرت کے امامین

ہمامین علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمہما اللہ کے نام ہے۔

نقش سرسید از جناب ضیاء الدین لاہوری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد صفحات ۲۱۰، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ رشیدیہ، بالمقابل مقدس مسجد اردو بازار کراچی، پاکستان۔

اس سے قبل جناب ضیاء الدین لاہوری کی دو اور کتابوں خودنوشت حیات سرسید اور خودنوشت افکار سرسید کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، وہ سرسید کے اعمال وافکار کے مطالعہ اور تجزیہ میں محتاج تعارف نہیں، اب یہ مجموعہ مضامین بھی مطالعہ سرسید میں ان کی غیر معمولی دلچسپی، انہماک اور محنت کا نمونہ ہے جس میں علماء، تعلیم انگریز، علی گڑھ کالج، مرزا قادیانی، دوقومی نظریہ، کانگریس اور سن ستاون کی تحریک آزادی کے تعلق سے سرسید کی سرگرمیوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے، عام خیال وتصور کے برخلاف ان مضامین کا مقصد اصل سرسید کی پہچان ہے جو فاضل مصنف کے خیال میں تضاد بیانی کے دبیز پردوں میں چھپ کر رہ گئی ہے، چنانچہ انہوں نے اس سرسید کی نقاب کشائی کی ہے جو معروف تصویر کی ضد ہے، یعنی وہ سرسید جو ۱۸۵۷ء کے واقعہ میں بجنور کے مسلمانوں کے قتل میں انگریزوں کے معاون اور اس تعاون پر نازاں اور انگریزوں کی جانب سے اعزاز وانعام وترقی اور پنشن پر مسرور وفرحاں نظر آتے ہیں، تعلیم وسیاست میں بھی ان کا منفی طرز نمایاں کیا گیا ہے، ان کے اصلاحی کارناموں کے پس پشت انگریز حکومت کے استحکام کا جذبہ وغیرہ بھی اسی قبیل میں آتا ہے، عموماً لہجہ منطقی متین اور معتدل ہے لیکن کہیں کہیں جوش وحدت کا احساس بھی ہوتا ہے، حقائق اور اپنے اخذ کردہ نتائج کے اظہار کے لئے کیا یہ ضروری ہے کہ غیر موافق راویوں کو تاویلاتی کذب نگاری اور کھلی منافقت سے تعبیر کیا جائے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مجموعی کردار کو جو اتنا بُرا نہیں سرسید کے اعمال خیر سے کس طرح جدا کیا جاسکتا ہے، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کے قلم سے ایک مختصر ابتدائی تحریر میں یہ خیال بھی محل نظر ہے کہ "سرسید کے سوانح نگاروں کا قلم علی گڑھ کے فن کار کے ہاتھ میں رہا ہے... جس سے ایک ملکوتی

پیکر تو تیار کر دیا گیا لیکن اس میں انسانوں کے لئے اخذ و اکتساب فیض کا بہت تھوڑا سا سامان تھا"۔

دبستان گورکھپور از جناب مسلم انصاری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت وطباعت مجلد، صفحات ۵۲ ۷، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: مسلم انصاری، الٰہی باغ، گورکھپور، یوپی۔

ریاض و فراق اور مہدی و مجنوں کا شہر گورکھ پور علم و ادب خصوصاً شعر گوئی اور سخن نوازی میں لکھنؤ کا ثمنی اور نقش ثانی رہا ہے، اس شہر کی علمی روایات کے قیام و بقا میں امراء و روساء اور عوام کا خاص حصہ رہا جس کے آثار و شواہد اردو کے دور اول سے ملتے ہیں، اس سے پہلے ڈاکٹر سلام سندیلوی نے تاریخ ادبیات گورکھپور لکھ کر اس داستان کو سمیٹنے کی کوشش کی تھی، اب مزید تحقیق و تفصیل سے لائق مولف نے زیر نظر کتاب میں تقریباً دو سو ستر ادیبوں اور شاعروں کے حالات، نثری و شعری نمونے سلیقہ و محنت سے یکجا کر دیے ہیں، مراجع و ماخذ میں کتابوں کے علاوہ براہ راست معلومات حاصل کرنے کی محنت شاقہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے، لائق مصنف کی حیثیت محض ناقل و راوی کی نہیں ہے بلکہ انہوں نے بعض مسلمات و مفروضات کی تحقیق بھی کی ہے، مثلاً تمنا گورکھپوری کو انہوں نے بدلائل گورکھپور کا اولین شاعر ثابت کیا ہے، ان کے لئے بجائے داعی کے دعا ت لکھ دیا گیا ہے، جا بجا طوالت واطناب اور بے جا مضمون آفرینی بھی ہے کہیں کہیں جذباتی رنگ اور تلخ لہجے کی وجہ سے اعتدال و توازن کا دامن بھی چھوٹ گیا ہے، مضامین کی تکرار اور لفاظی سے احتراز کیا جاتا تو تحریر اور ٹھوس ہوتی، ان باتوں سے قطع نظر ترتیب میں سلیقہ نمایاں ہے، ایک باب مرحومین کے لئے اور دوسرا ان صاحبان سخن کے لئے خاص ہے جو ہنوز حیات ہیں ایک اور باب میں گورکھپور کی تاریخی حیثیت اور وہاں اردو کی سرگرمیوں کا مفید جائزہ ہے، یہ دلچسپ ہے اور پر از معلومات بھی، اس قابل تحسین کتاب کے متعلق یہ رائے بالکل درست ہے کہ یہ ریسرچ کرنے والوں کے لئے نعمت ثابت ہوگی۔

ع۔ص۔

تصانیف مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

☆ **اسوۂ صحابہؓ:** (حصہ اول) اس میں صحابہ کرامؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق و معاشرت کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ قیمت۔ ۵۰/روپے

☆ **اسوۂ صحابہؓ:** (حصہ دوم) اس میں صحابہ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ قیمت۔ ۵۶/روپے

☆ **اسوۂ صحابیاتؓ:** اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاق اور علمی کارناموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ قیمت۔ ۲۰/روپے

☆ **سیرت عمر بن عبدالعزیز:** اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مفصل سوانح اور ان کے تجدیدی کارناموں کا ذکر ہے۔ قیمت۔ ۳۲/روپے

☆ **امام رازی:** امام فخرالدین رازی کے حالات زندگی اور ان کے نظریات و خیالات کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔ قیمت۔ ۳۵/روپے

☆ **حکمائے اسلام** (حصہ اول) اس میں یونانی فلسفہ کے ماخذ، مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اشاعت اور پانچویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے حالات، علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل ہے۔ قیمت۔ ۵۰/روپے

☆ **حکمائے اسلام** (حصہ دوم) متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات پر مشتمل ہے۔ قیمت۔ ۳۰/روپے

☆ **شعر الہند** (حصہ اول) قدماء سے دور جدید تک کی اردو شاعری کے تغیر کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ۔ قیمت۔ ۹۳/روپے

☆ **شعر الہند** (حصہ دوم) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔ قیمت۔ ۷۵/روپے

☆ **اقبال کامل:** ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح اور ان کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے۔ قیمت۔ ۸۰/روپے

☆ **تاریخ فقہ اسلامی:** تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات ذکر کی گئی ہیں۔ قیمت۔ ۱۲۵/روپے

☆ **انقلاب الامم:** سر تطور الامم کا انشاء پردازانہ ترجمہ۔ (زیر طبع)

☆ **مقالات عبدالسلام:** مولانا مرحوم کے اہم ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ قیمت۔ ۶۰/روپے